ماہنامہ

اظہار

کراچی

MAY 2023

یوم مزدور استحصالی نظام کے خلاف اسلام کی رو سے

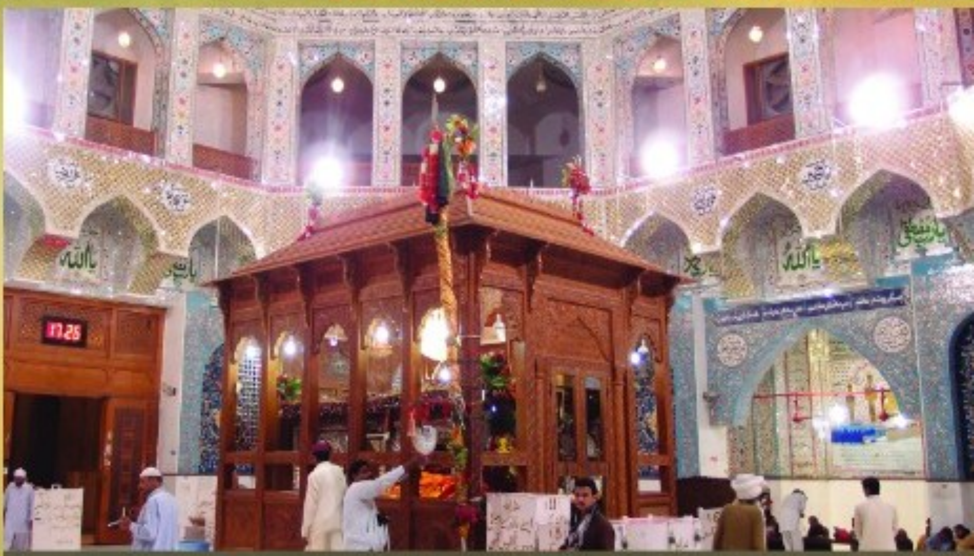

لعل شہباز قلندرؒ سندھ میں تصوف کے بانی

آسٹیوپوروسس ہڈیوں کا بھربھراپن

گٹکے کے خلاف حکومتِ سندھ کے مؤثر اقدامات

نفسیات کے نظریات اور تصورات

وزیر اعلیٰ سندھ سید مراد علی شاہ سے کراچی میں چین کے نئے قونصل جنرل مسٹر یانگ یونڈونگ نے ملاقات کی جنہوں نے وزیراعلیٰ ہاؤس میں ان سے ملاقات کی۔

پاکستان سینٹر فار آٹزم کے زیر اہتمام مقامی ہوٹل میں آٹزم: موجودہ چیلنجز اور آگے بڑھنے کا راستہ کے موضوع پر سیمینار کے آغاز میں وزیر اعلیٰ سندھ سید مراد علی شاہ بچے کی تلاوت کلام پاک سے متاثر ہوئے۔

ماہنامہ اظہار کراچی

جلد 27 شمارہ 05، مئی 2023ء

نگران اعلیٰ
شرجیل انعام میمن
وزیر اطلاعات، حکومت سندھ
نگران
ندیم الرحمٰن میمن
سیکریٹری اطلاعات، حکومت سندھ
....
مدیر اعلیٰ
منصور احمد راجپوت
ڈائریکٹر انفارمیشن پبلیکیشن
مدیرہ
ارم ملک
ڈپٹی ڈائریکٹر
......
نائب مدیرہ
رقیہ خانم
معاون کار
عثمان غنی
کمپوزنگ / لے آؤٹ
سید آفاق شاہ

رابطے کے لئے
ڈائریکٹر مطبوعات
محکمہ اطلاعات، حکومت سندھ
بلاک 95، سندھ سیکریٹریٹ 4-B کراچی، فون۔ 021-99202610
www.information.sindh.gov.pk/publications
publication.sid@gmail.com
@Publication_sid
@publication.sid

فہرست

•	اداریہ	ادارہ	
•	مذاہب عالم میں قربانی کا تصور	نسرین اختر	03
•	یوم مزدور استحصالی نظام کے خلاف اسلام کی رو سے	سید محسن علی	07
•	حضرت ادریسؑ زندہ جنت میں کیسے داخل ہوئے	قرۃ العین ذیشان	11
•	برصغیر کے مسلمانوں کی الگ وطن کی تحریک	محمود خان	13
•	لعل شہباز قلندر سندھ میں تصوف کے بانی	شہناز اختر	16
•	روسی شاعر پشکن کی اسلام سے دلچسپی	محمد سمیع اللہ	19
•	مسلمانوں کی اندلس میں کامیاب سے زوال تک کی تاریخ	عامر حسین	23
•	مرزا غالب محض شاعر نہیں بلکہ مفکر بھی ہیں	یسریٰ سلیم	26
•	فارسی شاعری میں سندھ کا تاریخی ذکر	محسن علی	33
•	گوپی چند نارنگ-اردو زبان وادب کے بادشاہ	مہوش اویس	37
•	گٹکے کے خلاف حکومتِ سندھ کے مؤثر اقدامات	سید عامر حسین	41
•	آسٹیوپوروسس ہڈیوں کا بھربھرا پن	محمد سلمان	44
•	نفسیات کے نظریات اور تصورات	اطہر بیگ	47
	سچ اور جھوٹ کا رزم نامہ	افسانہ بدر	50
•	وہی ستارے چراغ سحر میں رکھے ہوئے	محمد سلمان	54
•	صرف عنوان عرض حال ہے	مہوش اویس	55
•	خاموشی کے جہاں میں خاموشیاں	اطہر بیگ	56
•	The Rule of Glucagon in The Human Body	Yusra Saleem	1
•	Message of Tolerance	Sami ullah	3

ناشر: محکمہ اطلاعات، حکومت سندھ

پرنٹر: پیکاک پرنٹرس اینڈ پبلشرس، کراچی- فون: 0300-2152634

اداریہ

گٹکے کے خلاف حکومت سندھ کے موثر اقدامات

طبّی ماہرین کے مطابق ماوا گٹکا چھالیہ اور تمبا کو کا استعمال مضر صحت ہے، جو منہ کے کینسر کا باعث بن رہا ہے، کراچی میں منہ کے کینسر میں خطرناک حد تک اضافہ ہو رہا ہے، کینسر کا علاج بہت مہنگا ہے، لوگوں کو چاہیے کہ وہ ان اشیا کا استعمال ترک کر دیں اور اپنی صحت کا خیال کریں۔

حکومت سندھ کے موثر اقدامات کے باعث ماوا یا گٹکا کی فروخت پر مکمل پابندی عائد ہے، لوگوں کو اس عادت کو خود بھی ترک کرنا ہو گا، لوگوں کو چاہیے کہ وہ اپنی صحت کا خود خیال کریں، ماوا اور گٹکا تیار کرنے والوں کے خلاف مزید سخت ایکشن لیا جائے گا۔

صوبہ سندھ میں منشیات فروشی گٹکا اور مین پوری کے استعمال اور فروخت پر صوبائی وزیر اطلاعات شرجیل انعام میمن نے آئی جی سندھ غلام نبی میمن کو سخت نوٹس لینے کا حکم جاری کیا ہے۔

گٹکے کی فروخت کو روکنے کے لیے سندھ حکومت نے قانون سازی کر کے باقاعدہ ایکٹ کے طور پر قانون نافذ کیا ہے جس میں گٹکے کے کاروبار میں ملوث افراد کو مجرم قرار دیا ہے۔ اس منظور شدہ قانون کے تحت گٹکے کی فروخت اور استعمال میں ملوث افراد کو 3 سال قید اور 2 لاکھ روپے سے زائد جرمانے کی سزا ہو سکتی ہے۔

ادارہ

مذاہب عالم میں قربانی کا تصور

نسرین اختر

دین اسلام قربانی کا تصور پیش کرتا ہے۔ قربانی سے مراد مخصوص ایام میں مخصوص جانوروں کا ذبح کرنا ہے۔ اسلام میں اس کے لیے نسک، نحر، ہدی، قلائد، بھیمۃ الانعام، بدنہ اور قربانی جیسے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ جب کہ دیگر مذاہب میں اسے قربان، بھینٹ، بلوٹان، تھوسیا، یگیا اور قور بانیا جیسے ناموں سے پکارا جاتا ہے۔ عام طور پر قربانی کے فریضے کی ادائیگی کے لیے جانوروں اور مال کا انتخاب کیا جاتا ہے۔ لیکن گزشتہ ادوار میں بعض آدم خور وحشی قبائل اور دیگر مذاہب میں انسانوں کو بھی دیوتا کے چرنوں میں بھینٹ کے طور پر چڑھادیا جاتا تھا۔ اسلام میں قربانی کا مقصد رضائے الٰہی کا حصول، گناہوں کی معافی، سنت ابراہیمؑ کی پیروی اور حکم خداوندی کی تکمیل ہے۔ جب کہ دیگر مذاہب میں محض دنیاوی امور کے حصول، دیوتاؤں کی خوشنودی اور موسموں میں تبدیلی کے لیئے قربانی کی جاتی ہے۔

مذاہب عالم میں چند باتیں مشترک رہی ہیں، مثال کے پر تصورِ خدا، نجات دہندہ، دعا اور اپنے خالق ومالک کی خوشنودی کے لیے قربانی کا تصور، ان میں عملاً دعا اور قربانی زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ اگرچہ ان امور کے سرانجام دینے کے طریقۂ کار اور چناؤ میں اختلاف رہا ہے لیکن مقاصد اور نتائج میں سب متفق ہیں۔ یعنی اپنے خالق ومالک اور نجات

دہندہ و دیوتا کا قرب حاصل کرنا ہے۔ یوں دیگر مذاہب عالم اور اسلام کا تصور قربانی سب سے الگ ہے۔ اسلام مال، جان اور خاندان ہر چیز کی قربانی دینے کا درس دیتا ہے۔ لیکن ایسے کہ کسی کے حقوق ضائع نہ ہوں، قربانی سے مراد اللہ کی راہ میں جانور کی قربانی کرنا ہے، جو ہر مسلمان مرد و عورت عاقل و بالغ پر واجب ہے لیکن اس پر جو صاحب نصاب ہو۔ زکواۃ کے لیے تو مال کا سال بھر گزرنا ضروری ہے لیکن قربانی کے لیے طرف قربانی کرنے کی گنجائش ہو اور قربانی کرنے والا باآسانی قربانی کا جانور خرید سکتا ہو۔ قربانی محض اللہ کی رضا کے لیے کی جاتی ہے۔ یہ ہے اسلام میں قربانی کا تصور۔

قبل از اسلام مصری دریائے نیل کی روانی برقرار رکھنے کے لیے ہر سال ایک خوبصورت اور کنواری دوشیزہ کی قربانی دیتے تھے۔ جسے دلہن کی طرح سجا کر زیورات وغیرہ پہنا کر دریا کے عین وسط میں چھوڑ دیا جاتا تھا، جس کے بعد دریائے نیل رواں ہو جاتا۔ اسی طرح یہ سلسلہ حضرت عمر فاروقؓ کی خلافت کے زمانے سے پہلے تک چلتا رہا، حضرت عمر فاروقؓ نے جب یہ جاہلانہ فعل دیکھا تو ایک خط دریائے نیل کے نام تحریر کیا کہ۔ ''اے دریا! اگر تو اللہ کے حکم سے چلتا ہے تو ٹھیک ہے ہمیں تیری قدر ہے اگر تو اللہ کے حکم سے نہیں چلتا تو پھر ہمیں تیری کوئی غرض نہیں۔'' اسی طرح افریقہ، جنوبی امریکہ، انڈونیشیا، جرمنی اور سکنڈے نیویا کے بعض قبائل اپنے دیوتاؤں کے غضب سے بچنے، ان کی خوشنودی حاصل کرنے، کسی نئی عمارت پُل یا بادشاہ کی موت۔ یا ناگہانی آفت کے وقت انسانوں کی قربانی کیا کرتے تھے جس کی تصدیق ان ہڈیوں سے ہوتی ہے جنہیں آثار قدیمہ کے ماہرین نے کھدائی کے دوران برآمد کیا، ایتھنز کے باشی قربانی کے لیے بار برداری میں جوتے جانے والے بیل کا انتخاب کرتے تھے۔ قدیم ایرانیوں کے یہاں بھی قربانی کا تصور موجود تھا۔ چنانچہ وہ ''بہار گاؤ'' کے موقع پر ''اہور امزدا'' یعنی آگ، مٹی، ہوا اور پانی کی بقاء کے لیئے قربانی کیا کرتے تھے، البتہ قربانی کرنے کے طریقۂ کار میں کچھ اختلاف ہوتا تھا اور ان کی قربانی بھی عجیب و غریب انداز کی ہوتی تھی جیسے کوئی اپنے قربانی کے جانور کا آگ لگا دیتا تو کوئی جانور کی صرف دُم کو جلاتا اور کوئی اپنے جانور کو ودق صحرا میں مرنے کے لیے چھوڑ دیتا۔ قدیم زمانے میں یہ سب قربانی کے طریقے رائج تھے۔

یہودی قوم بھی قربانی کی قائل تھی۔ جب انہیں اپنے پیغمبروں کی جانب سے قربانی کا حکم ہوتا تو آبادی سے باہر اپنے جانور کو پہاڑ یا کسی اونچی جگہ پر جا کر چھوڑ دیتے، تھوڑی دیر میں آسمان سے آگ اترتی جو اس جانور کو جلا کر راکھ کر دیتی۔ یہ اس بات کی علامت ہوتی تھی کہ ان کی قربانی قبول کرلی گئی ہے۔ دنیا کے سب سے پہلے انسان حضرت آدمؑ کے بیٹوں ہابیل اور قابیل میں جب لڑکی کے معاملے میں اختلاف ہوا جس نے شدید جھگڑے کی صورت اختیار کرلی تو خدائے تعالیٰ نے ان دونوں بھائیوں سے قربانی مانگی۔ دونوں نے اپنی اپنی قربانی پہاڑ کی چوٹی پر پہنچادی۔ ہابیل کی قربانی اللہ تعالیٰ کے یہاں قبول ہوگئی اور جانور کو آگ آسمان سے آکر کھاگئی جبکہ قابیل کی قربانی اللہ کے یہاں قبول نہ ہوسکی۔ مشرکین مکہ بھی قربانی کیا کرتے تھے یعنی وہ قربانی کے قائل تھے، اور گاہے بہ گاہے اپنے جانور خانۂ کعبہ کی بھینٹ چڑھایا کرتے تھے۔ ان کے نام بحیرہ، سائبہ، وصیلہ اور حام رکھتے، اس کے ساتھ ساتھ نذر کے جانور بھی قربان کرتے، منیٰ میں قربانی کا بندوبست کیا جاتا جس میں سینکڑوں جانور ذبح کیے جاتے۔ مشرکین مکہ کے ہاں بھی انسانی جان کی قربانی کا تصور پایا جاتا تھا۔ یعنی قربانی کے لیے جانور اور انسانی جان دونوں برابر تھیں۔

قربانی کا جو تصور مسلمانوں کے ہاں پایا جاتا ہے وہ سب سے بہتر اور پسندیدہ ہے۔ مسلمان عیدالاضحیٰ کے مخصوص ایام میں اپنے

جانوروں کی قربانی محض رضائے الٰہی کے لیے کرتے ہیں۔اس قربانی کا کوئی دنیاوی مقصد نہیں ہوتا بلکہ یہ عمل خلیل اللہ حضرت ابراہیمؑ کی پیروری میں ان کی سنت میں کیا جاتا ہے۔ اس قربانی میں اللہ کی خوشنودی حاصل کرنا ہے۔ نیز اس بات کا اظہار بھی کرنا ہے کہ اے ہمارے رب! ''تونے ہم سے ہمارے جانوروں کی جان اور خون مانگے

ہیں۔ ہم تیری رضا کے لیے بہ خوشی دینے کے لیے تیار ہیں۔ صرف یہی نہیں، اگر تو ہم سے ہماری جان، ہمارا خون مانگے گا تو ہم اس کو دینے سے بھی دریغ نہیں کریں گے۔'' حکم الٰہی کے مطابق امت مسلمہ اپنے مخصوص جانوروں مثلاً اونٹ، بکرے، بھیڑ، دنبہ، گائے اور بھینس کو ذبح کرتے اور اس کا گوشت تین حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ ایک

حصہ اپنے لیے، ایک رشتے داروں اور احباب کے لیے اور ایک حصہ غرباء و مساکین کے لیے ہوتا ہے۔ اس طرح قربانی کے فوائد نچلے طبقات تک بھی پہنچ جاتے ہیں، یوں جن غریبوں کو سارا سال گوشت نصیب نہیں ہوتا، انہیں بھی عید قربان پر باسہولت گوشت مل جاتا ہے، قربانی تو صرف اللہ کے لیے ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ کے فرمان کا مفہوم ہے،

''اللہ کو نہ تو ان کا گوشت پہنچتا ہے نہ ان کا خون، لیکن اس کے پاس تمہارا تقویٰ پہنچتا ہے، اس نے یہ جانور اسی طرح تمہارے تابع بنادیے ہیں تاکہ تم اس بات پر اللہ کی بڑائی بیان کرو کہ اس نے تمہیں ہدایت عطا فرمائی اور جو لوگ خوش اسلوبی سے نیک عمل کرتے ہیں انہیں خوشخبری سنادو۔''

قربانی کا عبادت کے طور پر ادا کرنا اگرچہ حضرت آدم علیہ اسلام کے زمانے سے ثابت ہے، لیکن اس کی ایک خاص شان حضرت ابراہیمؑ کے واقعہ سے شروع ہوتی ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کو اللہ تعالی کی طرف سے خواب میں حکم ہوا کہ اپنے پیارے اکلوتے فرزند کو ہماری راہ میں قربان کرو۔ حضرت ابراہیمؑ نے اپنے ہونہار فرزند کو یہ حکم سنایا تو سعادت مند بیٹے کا جواب تھا کہ ''اے ابا جان! آپ کو جو حکم دیا گیا ہے آپ اس کو پورا کیجئے، انشاء اللہ آپ مجھے صبر کرنے والوں میں پائیں گے۔'' (الصافات 102)

پھر جب حضرت ابراہیمؑ اللہ تعالی کے اس حکم کی تعمیل کرنے لگے، بیٹے کو پہلو کے بل لٹا دیا اور گلے پر چھری رکھی تو چھری نے چلنے سے انکار کر دیا، پھر اللہ تعالی کی طرف سے آواز آئی ''اے ابراہیم! تم نے خواب سچ کر دکھایا۔'' (الصافات 105) پھر اللہ تعالی نے حضرت اسماعیلؑ کی جگہ ایک مینڈھا بھیج دیا جو ان کی جگہ قربان کیا گیا۔ اور پھر قربانی کا سلسلہ شروع ہو گیا جو تا قیامت رہے گا۔

حضرت ابراہیمؑ کا یہ واقعہ ہمیں درس دیتا ہے کہ ہمیں اللہ تعالی کے حکم کے سامنے سر تسلیم خم کر دینا چاہیے اور اللہ تعالی کی رضا کے لیے قربانی دینی چاہیے، دکھاوے کے لیے جانور قربان کرنے سے قربانی کا ثواب ضائع ہو جاتا ہے، اور یہ بھی معلوم ہوا کہ جانور قربان کرنے والے کو اس جانور کے ہر بال کے بدلے میں ایک نیکی دی جاتی ہے، دنبے اور بھیڑ کے بدن پر کے لاتعداد بال ہوتے ہیں اگر آپ صبح سے لے کر شام تک بھی ان بالوں کو شمار کرنا چاہیں تو شمار نہیں کر سکتے، تو گویا ایک جانور قربان کرنے سے لاکھوں نیکیاں مل گئیں، قربانی کے دنوں میں اللہ تعالی کے نزدیک انسان کا کوئی عمل قربانی کے جانور کا خون بہانے سے زیادہ پسندیدہ نہیں اور قیامت کے دن قربانی کرنے والا اپنے جانور کے بالوں، سینگوں اور کھروں کو لے کر آئے گا اور یہ چیزیں ثواب عظیم ملنے کا ذریعہ بنیں گی۔ نیز فرمایا کہ قربانی کا خون زمین پر گرنے سے پہلے اللہ تعالی کے نزدیک شرف قبولیت حاصل کر لیتا ہے لہذا تم خوشنودی خداوندی کے لیے خوش دلی کے ساتھ قربانی کرو۔'' (ترمذی)

ماہ ذی الحجہ کی 10، 11، 12 تاریخ، یہ تین دن قربانی کے ہیں اور ان میں پہلے دن کی قربانی دینا افضل ہے، اور قربانی کے ان تین دنوں میں اللہ تعالی کے ہاں سب سے زیادہ محبوب عمل جانور کو اس کی رضا کے لیے ذبح کیا جائے، قربانی کے خون کا قطرہ زمین پر بعد میں گرتا ہے اللہ کے ہاں وہ پہلے شرف مقبولیت پا لیتا ہے۔

یوم مزدور
استحصالی نظام کے خلاف اسلام کی رو سے

سید محسن علی

یکم مئی کے تاریخی دن کو عالمی سطح پر ''یوم مزدور'' کے طور پر منایا جاتا ہے۔ آج سے ٹھیک 134 برس قبل شکاگو میں محنت کشوں اور مزدوروں کی قربانیوں کو وہ حیثیت اور مقام ملا جس کو رہتی دنیا تک خراج تحسین پیش کیا جاتا رہے گا۔

دنیا کے تقریباً ہر ملک میں اجتماعات، پروگرام، مجالس، سیمینارز، جلسے جلوس اور ریلیوں کا اہتمام اور انعقاد ہوتا ہے۔ ترقی یافتہ ملک ہو، ترقی پذیر یا پسماندہ، مزدور کے حقوق کی آواز مئی کے آمد کے ساتھ ہی بلند ہونا شروع ہو جاتی ہے اور یہ بالکل بجا ہے کہ محنت کشوں اور مزدور کو یہ بنیادی اور جمہوری حق حاصل ہے کہ وہ توانا آواز کے ساتھ اپنے حقوق کی بات کر سکے کیونکہ آج کے ترقی یافتہ دور کے استحصالی نظاموں میں یہ غیر فطری ریت چل پڑی ہے کہ ''حق دیا نہیں جاتا بلکہ لیا جاتا ہے''۔

استحصالی نظام کے اس ظالمانہ تسلسل کا بڑا واقعہ یکم مئی 1886ء میں آج کی فرعونی مملکت کی ریاست شکاگو میں پیش آیا، جہاں مزدوروں کا حق مارنے والے حکومتی اہلکاروں، قارون کی طرح دولت کے انبار لگانے والے صنعت کاروں اور سانپ کی طرح کنڈلی مارے سرمایہ داروں نے نہتے مزدوروں پر حملہ کر دیا اور احتجاج کرنے والے شکاگو کے مزدوروں کو ظلم و ستم کا نشانہ بناتے ہوئے قتل و غارت کا بازار گرم کر دیا۔ جس سے ملک کی گلیاں، سڑکیں قتل ہونے والے مزدوروں کے خون سے ندی

نالوں کی شکل اختیار کر گئی۔ ہر طرف انسانی اعضاء بکھر گئے، لاشیں سڑکوں پر سر عام تڑپتی رہیں اور نالوں میں انسانی خون پانی کی طرح بہنے لگا، کئی دنوں سے جاری معرکہ آج یکم مئی کو اپنے عروج پر تھا، سارا دن امریکی حکمرانوں، سرمایہ داروں اور صنعت کاروں کی فرعونی خواہشات کی تسکین کی خاطر مزدوروں کا قتل عام ہوتا رہا۔ جوں جوں ظلم بڑھتا گیا مزدوروں اور ان کے لیڈروں کے حوصلے بلند ہوتے گئے۔ بے شمار لوگوں کو پھانسی دی گئی جو انہوں نے پھانسی کا پھندا نہیں بلکہ پھولوں کا ہار سمجھ کر پہنی اور مسکراتے ہوئے کہا ”تم ہماری زندگیاں تو ختم کر رہے ہو مگر ہمارا چھوڑا ہوا پیغام روک نہیں سکتے جو آنے والی نسلوں تک پہنچے گا“۔ حقوق کی خاطر ایک لیڈر نے کہا ”تمھاری طرف سے دی گئی پھانسی ہماری نئی زندگی ہے جو کبھی مٹنے والی نہیں تم نے پھانسی دے کر یہ ثابت کر دیا کہ ظالم اور مظلوم الگ الگ طبقے ہیں جو کبھی ایک نہیں ہو سکتے تمھارا یہی ظالمانہ اقدام دنیا بھر کے مظلوموں کے لئے اور سرمایہ داروں کی چکی میں پسنے والے مزدوروں کے لئے روشنی کا پیغام ہو گا اور ہمارے لہو کے قطرے آزادی اور حقوق کی راہ دکھاتے رہیں گے۔“

اسلام نے محنت کو بڑا مقام عطا کیا ہے اور محنت شخص کی بڑ حوصلہ افزائی کی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے (طبرانی) ”خود کمانے والا اللہ تعالیٰ کا دوست ہوتا ہے“ فرما کر محنت کی قدر و قیمت اجاگر فرما دی ہے۔۔ نیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان: ”کسی نے اپنے ہاتھوں کی کمائی سے بہتر کوئی کھانا نہیں کھایا۔“ (صحیح البخاری) آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مزدوروں کے حقوق کا اس حد تک پاس تھا کہ وصال سے

قبل آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کے لیے جو آخری وصیت فرمائی وہ یہ تھی کہ ”نماز کا خیال رکھو اور ان لوگوں کا بھی جو تمہارے زیر دست ہیں“ (احمد، ابوداؤد) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مزید فرمایا: ”تین قسم کے لوگ ایسے ہیں جن سے قیامت کے دن میں خود جھگڑوں گا۔ ان میں سے ایک وہ ہوگا جس نے کسی کام کروایا۔ کام تو اس سے پورا لیا مگر اسے مزدوری پوری ادا نہ کی۔“ (صحیح البخاری)

ایک مرتبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص سے مصافحہ کرتے وقت اس کے ہاتھوں پر کچھ نشانات دیکھے، وجہ پوچھی تو اس نے بتایا روزی کمانے میں محنت مشقت کرنے کی وجہ سے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا ہاتھ چوم لیا۔ مزید ارشاد فرمایا:

”مزدور کو اس کا پسینہ خشک ہونے سے قبل اس کی مزدوری ادا کر دو۔“ (ابن ماجہ)

”جو کوئی غیر آباد زمین کو آباد کرے تو وہ اسی کی ہے۔“ (گویا اس کی محنت نے اس کو مالکانہ حقوق عطاء کر دیئے) (احمد، ترمذی، ابو داؤد)

یہ دن منا کر ”عالمی ضمیر“ یہ تاثر دینا چاہتا ہے کہ وہ محنت کش طبقے کا بڑا قدر دان اور رکھوالا ہے۔ اسے حقوق انسانی کا بڑا پاس ولحاظ ہے۔ اسی لئے جب ان چند محنت کشوں پر زیادتی ہوئی تو پورا مغرب ان محنت کشوں پر ہونے والے مظالم کی تاب نہ لا سکا۔ اب ان کی یاد میں متعدد ریلیاں منعقد ہوتی ہیں۔ مظاہرے ہوتے ہیں۔ (بلکہ سڑکیں بلاک ہو جاتی ہیں) ان مزدوروں کے لئے حقوق و مراعات کا اعلان ہوتا ہے۔ ہر ملک کی ٹریڈ یونین ان حق میں متحرک اور فعال ہوتی ہے اور

ستم یہ کہ یہ سارا پروپیگنڈہ وہ سرمایہ دار طبقہ کرتا ہے جو غریبوں کا ہمدرد بن کر ان کی محرومیوں کو بلیک میل کرتا ہے۔

ہمیں پوری ''تاریخ اسلام'' میں امیری و غریبی کی بنا پر یا مالک و مزدور کی بنیاد پر نفرت و امتیاز کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ وہاں تو امیر و غریب کو، شاہ و گدا کو، کالے اور گورے سب کو بھائی بھائی کہ کر ایمان و ایقان کی ایک ہی لڑی میں پرو دیا گیا ہے۔

صدقات و ذکوۃ کے نظام اور بیت المال کے ذریعہ مساکین و یتامی کی اور دیگر تمام حاجت مندوں کی بنیادی ضرورتیں پوری کرنے کا بھی پورا اہتمام کیا گیا ہے۔

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دور میں بڑے بڑے امراء ورؤسا کے ہوتے ہوئے حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کو سالار لشکر مقرر کیا جاتا ہے۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو بڑے بڑے مال دار اصحاب کے ہوتے ہوئے جو قدر و منزلت ملی، وہ نسلی اور مادی تفاخر کے منہ پر بہت بڑا طمانچہ ہے۔ یہاں تو محمود و ایاز ایک ہی صف میں کھڑے ہو کر نماز ادا کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام نے اپنی بہترین تعلیمات کے ذریعے طبقاتی منافرت کی جڑیں کاٹ کر رکھ دی ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے۔ ''کہ اصل غنائے دل کا غنی ہونا ہے'' وہ دوسروں کے ساتھ حسن وسلوک سے پیش آتے ہیں، ہم کار مزدوروں سے اچھا سلوک کرتے اور ان کے قلب و ذہن کو اپنی باتوں سے سکون بہم پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ تنگ سے تنگ حالات میں بھی ایمان اور آدمیت کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ اس کے مقابلہ میں سرمایہ دارانہ رویہ ''دل کی تنگی'' کا نام ہے جس کا مطلب ہے ''سب فائدہ اپنے لئے ہر جائز ناجائز طریقے سے اکٹھا کرلینا اور دوسروں کو کچھ نہ دینا بلکہ سب کچھ اپنا ہی حق سمجھنا'' اور دوسروں کے لیے کوئی حق نہ سمجھنا۔ کیا مقابلہ ہے ایک صاحب ایمان، محنت کش، کارکن کا اور اس سرخ انقلاب کے نام پر دن رات اٹھتے بیٹھتے مزدوروں کا۔ نام تو جینے کا ہے۔ مگر در حقیقت ان کے منہ میں جانے والا نوالہ تک چھیننے والے کا مرید کا ہوتا ہے۔ ٹریڈ یونین تو غریب اور مزدور کو فریب دینے کے لئے سرخ انقلاب برپا کرنے والے بناتے ہیں اور یوم مئی روح کو جکڑ کر صرف جسمانی کھانے اور پہننے کی ضروریات کی ضمانت دیتا ہے۔ اور علاج معالہ اور تعلیم کے حقوق سے یکسر محروم رکھتا ہے) مگر پوری وہ بھی نہیں کر پاتا۔ جبکہ اسلام روح اور جسم دونوں کے فطری مطالبات واحتیاجات پورا کرنے کی ضمانت دیتا ہے۔

اسلام نے ''نظام اجرت'' کے بجائے ''نظام حقوق'' کی بحالی پر زور دیا ہے۔ یعنی ایک ملازم کو اتنا معاوضہ ضرور ملے جس سے وہ اپنے اہل وعیال کی بخوبی کفالت کر سکے اور انہیں بنیادی ضروریات زندگی بھی مہیا کر سکے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے خطبہ حجۃ الوداع میں بھی مزدوروں کے حقوق پر بڑا زور دیا۔

حضرت ادریسؑ
زندہ جنت میں کیسے داخل ہوئے

قرۃ العین ذیشان

آپ کا نام اخنوخ ہے آپ حضرت نوحؑ کے والد کے دادا ہیں حضرت آدمؑ کے بعد آپ ہی پہلے رسول ہیں آپ کے والد حضرت شیثؑ بن آدمؑ ہیں سب سے پہلے جس شخص نے قلم سے لکھا وہ آپ ہی ہیں کپڑوں کے سینے اور سلے ہوئے کپڑے پہننے کی ابتداء بھی آپ ہی سے ہوئی اس سے پہلے لوگ جانوروں کی کھالیں پہنتے تھے سب سے پہلے ہتھیار بنانے والے ترازو اور پیمانے قائم کرنے والے اور علم نجوم وحساب میں نظر فرمانے والے بھی آپ ہی ہیں یہ سب کام آپ ہی سے شروع ہوئے اللہ تعالی نے آپ پر تیس صحیفے نازل فرما اور آپ اللہ تعالی کی کتابوں کا بکثرت درس دیا کرتے تھے اس لئے آپ کا لقب ادریس ہو گیا اور آپ کا یہ لقب اس قدر مشہور ہو گیا کہ بہت سے لوگوں کو آپ کا اصلی نام معلوم ہی نہیں قرآن مجید میں آپ کا نام ادریس ہی ذکر کیا گیا ہے آپ کو اللہ تعالی نے آسمان پر اٹھا لیا ہے بخاری و مسلم کی حدیث میں ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے شب معراج حضرت ادریسؑ کو چوتھے آسمان پر دیکھا حضرت کعب احبارؓ وغیرہ سے مروی ہے حضرت ادریسؑ نے ملک الموت سے فرمایا کہ موت کا مزہ چکھنا چاہتا ہوں کیسا ہوتا ہے تم میری روح قبض کر کے دکھاؤ ملک الموت نے اس حکم کی تعمیل کی اور روح قبض کر کے اسی وقت آپ کی طرف لوٹا دی اور آپ زندہ ہو گئے پھر آپ نے فرمایا کہ اب مجھے جہنم دکھاؤ تا کہ خوف الہی زیادہ ہو چنانچہ یہ بھی کیا گیا جہنم کو دیکھ کر آپ نے داروغہ جہنم سے فرمایا کہ

دروازہ کھولو میں اس دروازے سے گزرنا چاہتا ہوں چنانچہ ایسا ہی کیا گیا اور آپ اس پر سے گزرے پھر آپ نے ملک الموت سے فرمایا کہ مجھے جنت دکھاؤ وہ آپ کو جنت میں لے گئے آپ دروازوں کو کھلوا

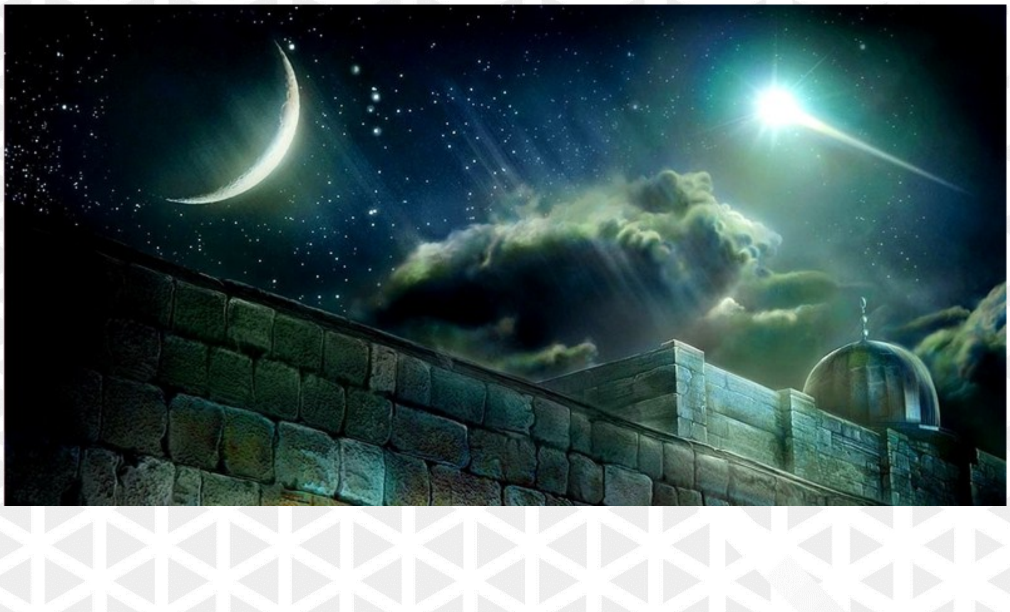

کر جنت میں داخل ہوئے تھوڑی دیر انتظار کے بعد ملک الموت نے کہا کہ اب آپ اپنے مقام پر تشریف لے چلئے آپ نے فرمایا کہ اب میں یہاں سے کہیں نہیں جاؤں گا اللہ تعالی نے فرمایا کہ کل نفس ذائقۃ الموت تو موت کا مزہ میں چکھ ہی چکا ہوں اور اللہ تعالی نے یہ فرمایا ہے کہ ہر شخص کو جہنم پر گزرنا ہے تو میں گزر چکا اب میں جنت میں پہنچ گیا اور جنت میں پہنچنے والوں کے لئے خداوند قدوس نے یہ فرمایا ہے کہ جنت میں داخل ہونے والے جنت سے نکالے نہیں جائیں گے اب مجھے جنت سے چلنے کے لئے کیوں کہتے ہو اللہ تعالی نے ملک الموت کو وحی بھیجی کہ حضرت ادریسؑ نے جو کچھ کیا میرے اذن سے کیا اور وہ میرے ہی اذن سے جنت میں داخل ہوئے لہذا تم انہیں چھوڑ دو وہ جنت ہی میں رہیں گے چنانچہ حضرت ادریسؑ آسمانوں کے اوپر جنت میں ہیں اور زندہ ہیں حضرت ادریسؑ کے آسمانوں پر اٹھائے جانے اور ان کو ملنے والی نعمتوں کا

مختصر اور اجمالی تذکرہ قرآن مجید کی سورہ مریم میں ہے اور کتاب میں ادریس کو یاد کرو بیشک وہ صدیق تھا غیب کی خبریں دیتا اور ہم نے اسے بلند مکان پر اٹھالیا یہ ہیں جن پر اللہ نے احسان کیا غیب کی خبریں بتانے والوں میں سے آدمؑ کی اولاد سے۔

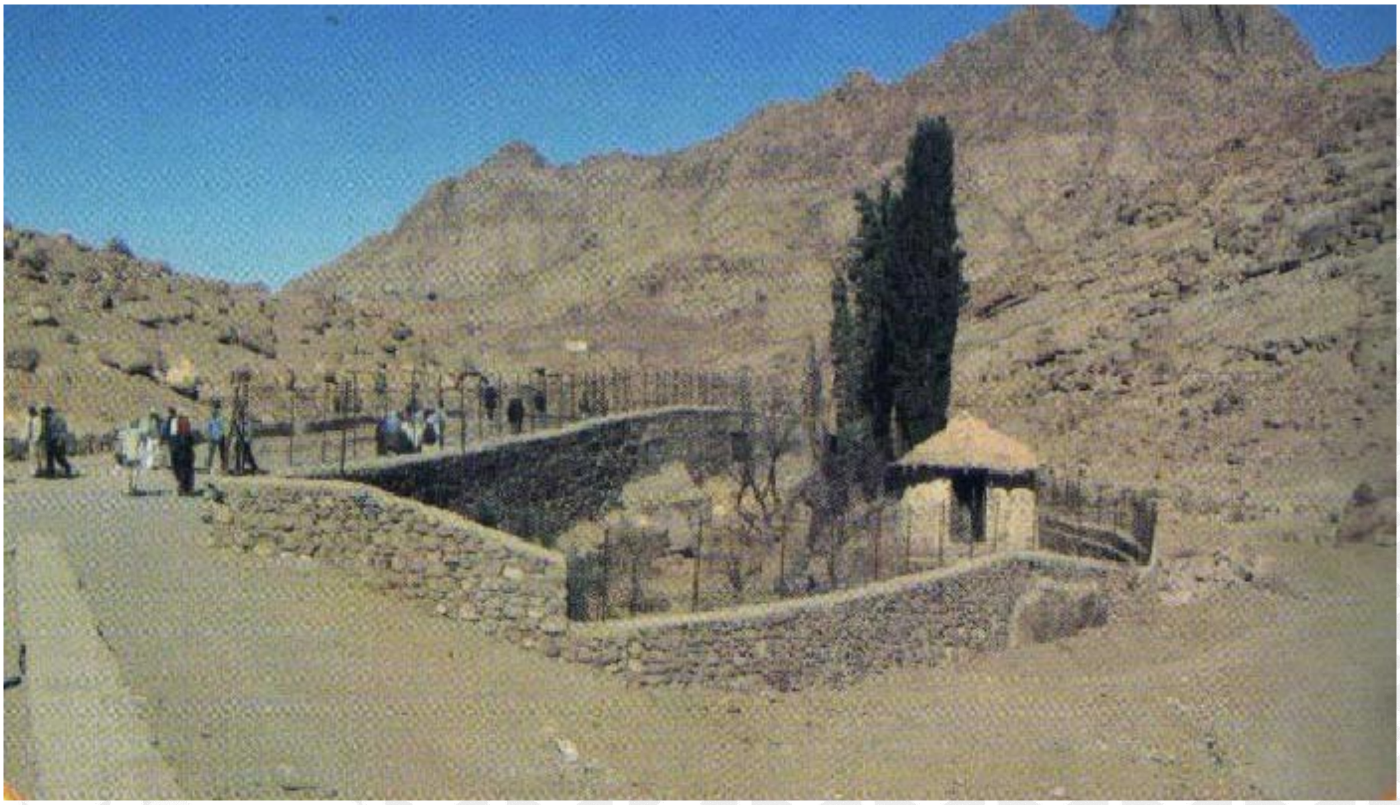

برصغیر کے مسلمانوں کی الگ وطن کی تحریک

محمود خان

پاکستان ایک جمہوری اور اسلامی ملک ہے۔23مارچ کو اس وقت لاہور کے منٹو پارک میں آل انڈیا مسلم لیگ کے تین روزہ سالانہ اجلاس کے اختتام پر ایک تاریخی قرارداد پیش کی گئی تھی، جس کی بنیاد پر مسلم لیگ نے برصغیر کے مسلمانوں نے الگ وطن کے لئے تحریک شروع کی اور سات سال کے مختصر عرصے میں مسلمان اپنا مطالبہ منظور کرانے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ اس کا بنیادی مقصد برصغیر میں مسلمانوں کے لئے الگ وطن کے حصول کی تحریک ہے۔ جس کی بنیاد مسلم لیگ نے برصغیر میں رکھی۔23 مارچ1940ء کو پاکستان کی بنیاد رکھی گئی۔یوم پاکستان غیور مسلمانوں کے اس عظیم عہد کی یاد دلاتا ہے کہ جنہوں نے 23مارچ 1940 کو ایک قرارداد پیش کی تھی، جس کی بناء پر پاکستان کے نام سے معرض وجود میں آنے والی اسلامی جمہوری مملکت لازوال قربانیوں کا ثمر ہے۔لہذا23مارچ کا دن برصغیر میں رہنے والے مسلمانوں کی تاریخ کا ایک سنہری باب ہے کیونکہ اس دوران برصغیر کے مسلمانوں نے قائداعظم محمد علی جناح کی قیادت میں مسلمانوں کے لئے ایک الگ وطن کا مطالبہ کیا تھا، جسے قرارداد لاہور کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔23مارچ1940ء کا دن ملکی تاریخ اور جدوجہد آزادی کا اہم موڑ ہے،اس دن کو مسلمانان برصغیر نے قائداعظم کی قیادت میں اپنے لئے واضح نصب العین کا تعین کیا تھا۔ تحریک پاکستان کے موقع پر بھارت میں رہنے والے مسلمانوں نے اسی قرارداد کے توسط سے ایک الگ وطن حاصل کرنے کا مطالبہ کیا تھا۔اسی قرارداد نے مسلمانوں کی جدوجہد کو آسان بنانے ہیں بڑااہم کردار ادا کیا۔اس قرارداد کے پیش کرنے سے پہلے تین روز اجلاس منعقد ہوئے۔اس اجلاس میں قائداعظم محمد علی جناح نے اپنا صدارتی خطبہ بھی پیش کیا تھا۔یہ امر حقیقی ہے کہ نظریہ پاکستان کی آبیاری اور تحفظ کا فریضہ ادا کرتے ہوئے قوم بھرپور انداز

میں اس دن کو مناتی ہے۔ یوم پاکستان کے موقع پر پوری قوم متحد ہو کر ملک کی نظریاتی سرحدوں کے محافظ کی حیثیت سے دشمنانِ پاکستان و اسلام کی ہر سازش کا منہ توڑ جواب دیتے رہے ہیں۔ آج جس عزم صمیم کے ساتھ پوری قوم اور عساکر پاکستان ملک کی سالمیت کے خلاف دہشت گردوں اور ان کے سرپرستوں کے گھنانے ایجنڈے کو ناکام بنانے کیلئے کمربستہ ہیں، قوم ان کے شانہ بشانہ کھڑی ہے اور دہشت گردی کی جنگ میں سرخروئی کا متمنی ہے۔ یوم پاکستان کا دن ملکی تاریخ اور جدوجہد آزادی کا اہم موڑ ہے، اس دن کو مسلمانان برصغیر نے قائدِاعظم کی قیادت میں اپنے لئے واضح نصب العین کا تعین کیا تھا۔ اس دن کی مناسبت سے پاکستان کے تحفظ یوم پاکستان غیور مسلمانوں کے اس عظیم عہد کی یاد دلاتا ہے کہ جنہوں نے 23مارچ 1940 کو ایک قرار داد پیش کی تھی جس کی بناء پر پاکستان کے نام سے معرض وجود میں آنے والی اسلامی جمہوری مملکت لازوال قربانیوں کا ثمر ہے۔ اسی دن کی مناسبت سے قیام پاکستان اور استحکام پاکستان کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دینے والے ان شہیدوں اور غازیوں کو خراجِ عقیدت پیش کیا جاتا ہے کہ جن کے نقش قدم پر چلتے ہوئے وطنِ عزیز کی ترقی، خوشحالی اور سالمیت کے لیے کسی قربانی سے دریغ نہیں کیا جاتا۔ یوم پاکستان کے موقع پر دشمن کو دفاع وطن کے مضبوط ہونے کا ٹھوس پیغام دینا ہے جس کے لئے سیاسی انتشار سے گریز اور قومی یکجہتی کو فروغ دینے کی ضرورت ہے۔ 83سال قبل 23مارچ 1940ء کو لاہور میں قرار داد پاکستان منظور کی گئی، اس موقع پر برصغیر کے مسلمانوں نے اپنی آزادی اور منزل کا تعین کیا تھا، یہی وجہ ہے کہ آج تک پاکستانی قوم پورے جوش خروش سے یوم پاکستان مناتی آرہی ہے اور اس عزم کا اعادہ کررہی ہے کہ وہ آج کے چیلنجوں کا پوری جرات اور دانشمندی کے ساتھ مقابلہ کرتے ہوئے اپنی آزادی اور قومی سلامتی کا ہر قیمت پر دفاع کرے گی اور پاکستان کے تمام حصوں کو امن اور ترقی کا گہوارہ بنائے گی۔

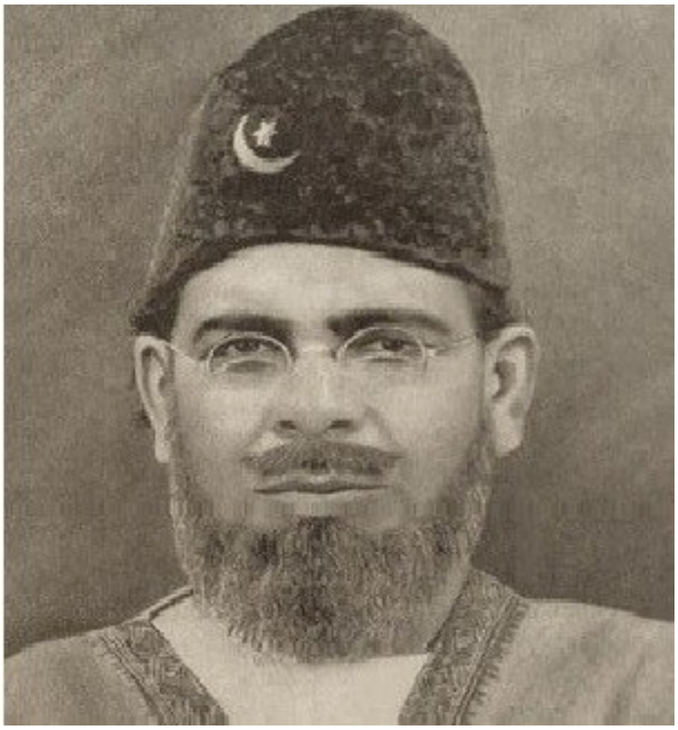

دوسری جانب ہندوستان میں مولانا محمد علی جوہر اور اُن کے بھائی مولانا شوکت علی نے تحریک خلافت چلائی کیونکہ عالمی جنگ اوّل کے دوران انگریز نے ہندوستان کے مسلمانوں سے یہ وعدہ کیا تھا کہ وہ ترکیہ کی مسلم خلافت کو برقرار رکھیں گے مگر ایسا نہ ہوا اور اس تحریک کے دوران بھی گاندھی جی نے اپنے عدم تشدد کے فلسفے کی آڑ لے کر اس تحریک کو نقصان پہنچایا جب کہ 1916ء میں جب جنگ عظیم اوّل جاری تھی اور ابھی کسی کو نہیں معلوم تھا کہ اس جنگ میں کون فتح یاب ہوگا تو مسلم لیگ اور کانگریس کے سالانہ اجلاس لکھنو میں منعقد ہوئے تو قائد اعظم جن کی عمر اُس وقت 40 سال تھی، انہوں نے مسلمانوں اور ہندوؤں کی اُن دونوں نمائندہ جماعتوں کے درمیان میثاق لکھنو کروایا جس میں کانگریس نے مسلمانوں کو ہندوستان کی دوسری بڑی اکثریت کے طور پر تسلیم کرتے ہوئے جداگانہ طریقہ انتخاب سمیت ہندوستان

میں مسلمانوں کے تشخص کے تحفظ کی آئینی گارنٹی دینے پر اتفاق کیا، یہ شاید اس لیے کیا تھا کہ ہندو یہ سمجھتے تھے کہ اُس وقت اگر جنگ عظیم اوّل ترکیہ اور جرمن جیت جاتے تو یہ معاہدہ میثاق لکھنوٴ اُن کے حق میں بہتر رہتا اور پھر وقت نے ثابت کر دیا کہ ہندوؤں کی جماعت کانگریس کے موتی لال نہرو نے یہ معاہدہ یک طرفہ طور پر 1928ء میں مسترد کر دیا، قائد اعظم یہ جانتے تھے کہ اگر یہ معاہدہ برقرار رہتا تو ہندوستان تقسیم ہوئے بغیر اور جلد آزاد ہو سکتا ہے، اس لیے میثاق لکھنو کو بچانے کے لیے قائد اعظم نے 1929ء میں اپنے مشہور چودہ نکات پیش کئے مگر کانگریس نے اِن کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کے دوسرے سال ہی علامہ اقبال نے الہ آباد میں آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کی صدارت کی اور اپنے صدارتی خطبہ میں اُس وقت پاکستان کا تصور پیش کیا، اسی طرح انڈیا ایکٹ 1935ء میں قائد اعظم محمد علی جناح کے 14 نکات میں سے کچھ نکات اس قانون میں شامل کر لیے گئے یعنی اس میں مسلمانوں کے لیے جداگانہ طریقہ انتخاب کو مان لیا گیا اور سندھ کو بمبئی سے الگ کر کے صوبے کا درجہ دے دیا گیا اور خیبر پختونخوا میں سیاسی اصلاحات نافذ کی گئیں جب کہ 1927ء اور 1929ء میں قائد اعظم محمد علی جناح نے بلوچستان کو بھی صوبے کا درجہ دینے کا مطالبہ پیش کیا تھا، اس کو انگریز نے پورا نہیں کیا، 1935ء کے قانون ہند کے تحت 1937ء میں ہندوستان کے گیارہ صوبوں میں انتخابات ہوئے اِن انتخابات میں کانگریس نے مسلم نشستوں پر اپنے مسلم ارa کین کھڑے کئے، اِن انتخابات میں کانگریس نے مسلم لیگ کے مقابلے میں زبردست فتح حاصل کی اور 9 صوبوں میں اپنی صوبائی وزارتیں (حکومتیں) تشکیل دیں اور باقی دو صوبوں میں مقامی جماعتوں کی شراکت سے مخلوط حکومتیں بنائیں۔ ادھر 1939ء میں ہٹلر نے پولینڈ پر قبضے کے ساتھ ہی دوسری جنگ عظیم کا آغاز کر دیا جس پر قائد اعظم نے مسلمانوں کو کانگریس کی حمایت سے دور رکھا اور یوم نجات منایا کیونکہ کانگریس کی وزارتوں کے دوران مسلمانوں کو ہندو اقتدار سے بہت نقصان پہنچایا تھا اور اس لیے ہندوستان کے مسلمانوں نے قائد اعظم کی مسلم لیگ کو اپنے لیے تحفظ کا قلعہ جانا، جب کانگریس نے انگریزوں کے خلاف تحریک شروع کی تو برصغیر کے مسلمان اس تحریک سے اس لیے دور رہے کہ اُس وقت کی 40 کروڑ کی آبادی والے مشترکہ یا غیر منقسم ہندوستان جس میں مسلمانوں کی آبادی کا تناسب تیس فیصد سے زیادہ تھا۔ اُس مشترکہ اور غیر منقسم ہندوستان کی آزادی کی صورت میں، تقریباً 14 کروڑ مسلمانوں کے لیے کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان میثاق لکھنو 1916ء جیسا کوئی معاہدہ نہیں تھا جو مشترکہ ہندوستان کی آزادی کے بعد ہندوستان کے مسلمانوں کے مذہبی، سیاسی، جمہوری، ثقافتی، تہذیبی، تمدنی حقوق کے تحفظ کی ضمانت دے سکتا ہو اور چونکہ کانگریس 1937ء کے صوبائی الیکشن میں مسلم لیگ کو عبرت ناک شکست دے چکی تھی، اس لیے اس کو گھمنڈ تھا کہ مسلمان اب بھی کانگریس کا ساتھ دیں گے مگر ایسا نہ ہوا اور باوجود اس کے کہ انگریز دوسری جنگ عظیم کی وجہ سے سخت دباؤ میں تھا، اُس کو قائد اعظم کے موقف کو بھی دیکھنا پڑا اور جنگ عظیم دوئم کے باوجود انگریزوں نے کانگریس کا دباؤ قبول نہیں کیا۔ یوں 14 اگست 1947ء کو پاکستان وجود میں آیا، مگر اس کے قیام میں لارڈ ماونٹ بیٹن جو بھارت کی آزادی کے بعد بھی بھارت کے گورنر جنرل رہے اُنہوں نے کانگریس سے مل کر ریڈکلف کے ذریعے بددیانتی کرتے ہوئے مشرقی پنجاب میں مسلم اکثریت کے اضلاع گورداسپور اور فیروز پور بھارت کو دے دیئے، اسی طرح کشمیر میں مسلم اکثریت کے باوجود مہاراجہ ہری سنگھ سے ساز باز کرتے ہوئے ریاست جموں وکشمیر کو بھارت میں شامل کر دیا اور اس کا ایک بڑا حصہ پاکستان نے مجاہدین کی مدد سے آزاد کروالیا جو اب آزاد کشمیر کہلاتا ہے۔

لعل شہباز قلندر
سندھ میں تصوف کے بانی

شہناز اختر

لعل شہباز قلندر آپ کو سندھ میں تصوف کا بانی کہا جاتا ہے اور لعل شہباز قلندر کے نام سے معروف ہیں۔ آپ کو ''لعل'' یاقوتی رنگ کا خرقہ زیب تن کرنے اور پُرکشش شخصیت کی بناپر، ''شہباز'' شرافت اور خداپرستی اور ''قلندر'' قلندرانہ مزاج وانداز کی بنا پر کہا جانے لگا اور آج تک آپ کو لعل شہباز قلندر یا سخی شہباز قلندر نہایت احترام کے ساتھ کہا جاتا ہے۔ آپ کا شجرہ نسب امام جعفر (رض) سے جا کر ملتا ہے۔

آپ کے تین اور دوست تھے، حضرت بہاؤالدین زکریاؒ، بابا فریدالدین گنج شکرؒ اور سیّد جلال الدینؒ۔ آپ چہاروں اولیاء کرام کی روحانی دوستی کو چہار یار کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ چہار یار سندھ اور ہند میں اسلام کی تبلیغ میں پیش پیش تھے اور بہت سارے غیر مسلم آپ کے دست مبارک سے مشرف بہ اسلام ہوئے۔

حضرت لعل شہباز قلندرؒ کا پیغام امن و آشتی پر مبنی ہے جو رنگ و نسل کی تفریق کے بغیر اپنے خالق کی بنائی ہوئی تمام مخلوقات کو محبت و پیار اور امن کا درس دیتا ہے۔ اگر ہم امن چاہتے ہیں تو دوسروں کے لئے آسانیاں پیدا کریں اور امن کی تلاش کے لئے قلندر پاک کی تعلیمات سے رہنمائی حاصل کرنی چاہئے۔

آپ کی شاعری عشق حقیقی اور انسانوں کی ایک دوسرے سے محبت اور بھائی چارے کے درس پر مبنی ہے۔ انکی ایک غزل بہت مشہور

ہے جس کی ردیف 'می رقصم' ہے:

نمی دانم کہ آخر چوں دمِ دیدار می رقصم
مگر نازم بہ ایں ذوقے کہ پیشِ یار می رقصم

نہیں جانتا کہ آخر دیدار کے وقت میں کیوں رقص کر رہا ہوں، لیکن اپنے اس ذوق پر نازاں ہوں کہ اپنے یار کے سامنے رقص کر رہا ہوں۔

تو ہر دم می سرائی نغمہ و ہر بار می رقصم
بہ ہر طرزِ کہ می رقصانیَم اے یار می رقصم

تو جب بھی اور جس وقت بھی نغمہ چھیڑتا ہے میں اسی وقت اور ہر بار رقص کرتا ہوں، اور جس طرز پر بھی تو ہمیں رقص کرواتا ہے، اے یار میں رقص کرتا ہوں۔

تُو آں قاتل کہ از بہرِ تماشا خونِ من ریزی
من آں بسمل کہ زیرِ خنجرِ خوں خوار می رقصم

تُو وہ قاتل کہ تماشے کیلیے میرا خون بہاتا ہے اور میں وہ بسمل ہوں کہ خوں خوار خنجر کے نیچے رقص کرتا ہوں۔

بیا جاناں تماشا کن کہ در انبوہِ جانبازاں
بہ صد سامانِ رسوائی سرِ بازار می رقصم

آ جا جاناں اور دیکھ کہ جانبازوں کے گروہ میں، میں رسوائی کے صد سامان لیے سر بازار رقص کر رہا ہوں۔

اگرچہ قطرۂ شبنم نہ پویَد بر سرِ خارے

منم آں قطرۂ شبنم بہ نوکِ خار می رقصم

اگرچہ شبنم کا قطرہ کانٹے پر نہیں ٹھہرتا لیکن میں وہ قطرۂ شبنم ہوں کہ نوکِ خار پر رقص کرتا ہوں۔

خوش آں رندی کہ پامالش کنم صد پارسائی را
زہے تقویٰ کہ من با جبّہ و دستار می رقصم

واہ وہ رندی کہ جس کیلیے میں سیکڑوں پارسائیوں کو پامال کر دوں، مرحبا یہ تقویٰ کہ میں جبہ و دستار کے ساتھ رقص کرتا ہوں۔

منم عثمانِ مروندی کہ یارے شیخ منصورم
ملامت می کند خلقے و من بر دار می رقصم

میں عثمان مروندی کہ شیخ منصور (حلاج) میرے دوست ہیں، مجھے خلق ملامت کرتی ہے اور میں دار پر رقص کرتا ہوں۔

سخی شہباز قلندرؒ قلندری رنگ میں فرماتے ہیں کہ یہ سب راز کی باتیں ہیں اور میں انہی بھیدوں کے تحت رقص کرتا ہوں اگر مجھے صبح و شام دنیا والے ملامت کریں تو میرے اندر تو محبوب کا عشق ہے۔ میں کھلم کھلا سرعام دھمال ڈالتا ہوں اور رقص کرتا ہوں۔ میں عشق الٰہی میں اپنے آپ کو اس قدر ڈبو کر محو ہو جاتا ہوں کہ دنیا والے مجھے نہ دیکھ سکتے اور نہ سمجھ سکتے ہیں۔

قلندر پاکؒ کے نزدیک دنیا مصائب و آلام کا گھر ہے یہ کائنات فانی ہے اس سے محبت ہی تمام برائیوں کی جڑ ہے، دنیا ٹھہرنے کی جگہ نہیں بلکہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر چلے جانے کی جگہ ہے۔ آپ کا سارا کلام عشق و محبت سے بھرا ہوا ہے۔ اپنے اندر درد کی داستان لئے ہوئے ہے، جس میں قلندری شاعری کی جھلک ملتی ہے اور درگاہی ادب عیاں ہے، ہر رنگ میں خداوند کریم کی ذات کو راضی رکھا گیا ہے۔ کہ بس تو ہی تو ہے۔ یہ شاعری وہی سمجھ سکتا ہے جو درگاہی ادب سے واقف ہو۔ آج بھی صوفیا کرام کی محفلوں میں آپ کا کلام پسند کیا جاتا ہے، درویش آپ کا کلام سن کر بہت خوش ہو کر بلند آواز میں کلام پڑھتے ہیں۔

روسی شاعر پشکن کی اسلام سے دلچسپی

محمد سمیع اللہ

روس کے قومی شاعر ہیں بلکہ 37 سال کی جواں عمری میں ایک ڈوئیل میں ان کی دلیرانہ موت نے انہیں ایک ایسے رومانوی ہیرو کے کردار میں تبدیل کر دیا ہے جسے روسی اپنا آئیڈیل سمجھتے ہیں۔

الیکساندر پشکن (Alexandre Pushkin) کی اسلام سے شناسائی شمالی قفقاز اور کریمیا کے سفر کے دوران ہوئی تھی۔ انہوں نے مسلمانوں کی ثقافت سے وابستہ یادگاریں دیکھی تھیں، ان کی مانگی گئیں دعائیں سنی تھیں اور ان کی عبادات کا مشاہدہ کیا تھا۔ وہاں انہوں نے اپنی نظمیں ''قفقاز کا قیدی'' اور ''بخشی سرائے کا چشمہ'' لکھی تھیں۔

مشرق، اسلام اور پیغمبر محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ پشکن کی رغبت نے ان کے معاصرین کو متحیر کر کے رکھ دیا تھا۔ شاعر نے اپنے دوست دینیس داوید و کو لکھا تھا، ''سبد مشرق میرے لیے ایک ایسی مثال تھی جتنی ہم عقل کے ماتوں یورپیوں کے لیے ہو سکتی ہے۔ دوست اور شناسا انہیں ''محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا صحابی'' کہنے لگے تھے۔ ان کے عرب جد امجد ہنی بال کے متعلق لکھا گیا تھا۔ نظم ''قفقاز کا قیدی'' درحقیقت چیچنیا کے دکھ بھرے واقعات سے متعلق تھی جو حقیقی ''قفقاز کے قیدیوں'' سے متعلق ہے۔ منظومات ''چرکیسیا کا گیت'' اور ''چیچن دریا کو جاتا ہے'' کے آخری بند محاوروں میں ڈھل گئے جو کسی بھی شخص کو درپیش خطرات سے متعلق استعمال کیے جا سکتے ہیں۔ ایک وقت پہ قفقاز میں جنگیں لڑنے والے ادیبوں میخائیل لرمینتو و اور لیو تالستوئی نے بھی اسی طرح کی آراء کا اظہار کیا ہے۔ ان دونوں عبقریوں نے مختلف شکلوں میں پشکن کی فکر کو پیش کیا ہے اور ضروری بات یاد دلائی ہے کہ ''ہمیشہ کرب میں نہیں رہا جا سکتا اور نہ ہی مستقل طور پر فرار رہا جا سکتا ہے، اس سب کا اختتام ہونا ہے۔ وقت آئے گا جب ہم امن سے دوستوں کی مانند رہیں گے۔''

اپنی معروف نظم ''بخشی سرائے کا چشمہ'' کی ابتدا، پشکن نے نامور فارسی شاعر سعدی کے الفاظ سے کی ہے، ''میری طرح اور بہت سے اس چشمے تک پہنچے ہیں، ان میں سے بہت سے نہیں ہیں اور بہت سے ابھی راستے میں ہیں۔'' نظم ''تاتاروں کا گیت'' میں قرآن کی آیات کا پرتو ہے، حج کے لیے مکہ جانے کا تذکرہ ہے اور شہیدوں کے لیے جنت کی وعید کا ذکر ہے:

کرب و مصائب کے بعد
گردوں سے تسلی وعدہ ہے
متقی فقر سہے
اور بڑھاپے میں مکہ جائے
تو اس کا اجر ملے گا اسے

الیکسانذر پشکن کی نظم ''قرآن کا پیغام'' خاص طور پر قابل توجہ

ہے۔اس نظم کی پہلی سطور میں پیغمبر محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر اتارے گئے قرآن کریم کے پیغام، قوی خالق کے رحم اور اللہ کی پیغمبر سے محبت کا ذکر ہے اور قیامت کے روز مومنوں کے لیے اللہ کے کرم اور جنت دیے جانے کی بات کی گئی ہے:

فریب کاروں کو پسند نہ کرو
صراط المستقیم پر چلتے رہو
یتیموں سے
اور میرے دیے قرآن سے پیار کرو
لوگوں کو دین کی دعوت دیتے رہو

یتیموں سے انصاف کرنے کی بات قرآن میں کئی جگہ کہی گئی ہے۔ جہاد میں شہید ہونے والوں کے بچوں سے پیغمبر اسلام کا پیار کسی سے پوشیدہ نہیں تھا۔ ''میرا قرآن'' دراصل اللہ کی طرف سے کہا گیا ہے کہ میرا قرآن تم یعنی پیغمبر (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر نازل کیا گیا۔

نظم پیغام کا دوسرا حصہ ازدواج مطہرات کے بارے میں ہے۔

اے پیغمبر کی پاک بیویو
تم تمام بیویو سے افضل ہو
گناہ کا پر تو بھی تمہارے لیے
موجب خوف ہے

قرآن میں کہا گیا ہے: ''اے پیغمبر کی بیویو! تم دنیا کی باقی تمام بیویوں کی طرح نہیں ہو اگر تم نیکی پر کاربند رہو، تمہارے دلوں میں دوسروں کے لیے درد ہو اور تم اچھے لفظوں میں باتیں کرو۔''

نظم ''تمثیل'' کے تیسرے حصے میں سورۃ حج کی آیات کا عکس ہے:

فرشتہ ثور پھونکے گا جو دو بار
زمیں ساری دہل جائے گی یک دم
برادر چھوڑ بھاگے گا برادر
پسر کو ماں کی بھی پرواہ نہ ہو گی
سبھی خالق کے آگے پیش ہونگے
سبھی کے چہرے بالکل فق ہونگے
جو کافر ہیں وہ دوزخ میں گریں گے
جنہیں آگ اور راکھ مل کر ڈھانپ لیں گے

آخری چہار مصرعہ شاعری میں اکثر آیات کے مضامین ہیں، مثال کے طور پر: ''اس روز، تم دیکھو گے، کہ سب دودھ پینے والے بھول جائیں گے کہ کس نے دودھ پلایا تھا، ہر حاملہ کا حمل گر جائے گا۔ تمہیں لوگ مخمور دکھائی دیں گے لیکن وہ مخمور نہیں ہونگے۔ اللہ کا عذاب بہت سخت ہے۔''

نظم ''تمثیل'' کے پانچویں حصے کے دو قطعات میں، مخلوق اور اللہ کی عظمت کا ذکر ہے:

مستجب آج مانگتا ہے دعا،
تو قوی و کریم ہے مولا
تو جھلستے ہوئے دن میں
خنک باد صبا چلاتا ہے،
آسماں پہ لے آتا ہے بادل،
اے کریم و مقیط و مستغفر
تو نے قرآں کو کھول کر بھیجا
ہم بھی اس روشنی سے پھولے پھلے
آنکھوں پر جو پڑا تھا پردہ ہٹا

جب پشکن اصطلاح ''قرآن مقدس'' استعمال کرتے ہیں تو وہ اس کے ''واضح، بابرکت، شیریں سخن اور پر از فہم'' ہونے کا اقرار کرتے ہیں۔

''ہم بھی اس روشنی سے پھولے پھلے'' اسلام کے عالمی ہونے کی عکاسی کرتا ہے۔ جس طرح دریا سمندر میں گرتے ہیں، اسی طرح

یہودیوں، عیسائیوں، ملحدوں اور کافروں میں سے لوگ اسلام کے دھارے میں شامل ہوتے رہتے ہیں۔ روشنی سے ان کی مراد اللہ ہے، جس طرح کے ایک سورت کے معانی ہیں ''اللہ زمین و آسمان کا نور ہے۔ اللہ کا نور اسے دیکھنے کو ملے گا جسے اللہ اپنا جلوہ دکھانا چاہے گا۔۔۔''

جہاں تک نظم کے چھٹے حصے کا تعلق ہے، وہ کافروں اور بت پرستوں کے ساتھ لڑتے ہوئے میدان جنگ میں شہید ہونے والوں سے منسوب ہے۔ اس میں جنت کا ذکر ہے، جو شہدا کا مقدر ہے۔

نظم کے ساتویں حصے میں قرآن کی سورۃ آل عمران کا مضمون ہے۔ یہ سورۃ محمد ﷺ سے مخاطب ہے کہ ''کھڑے ہو جاؤ'' پیغمبر اسلام مکہ میں پیدا ہوئے تھے، جہاں تب کفار، یہودی اور عیسائی رہتے تھے، جن کے سامنے نیا مذہب پیش کیا جانا تھا، اس لیے انہیں ڈٹ جانے کو کہا گیا تھا:

ڈرومت، اٹھ کھڑے ہو!
تمہاری غار میں شمع مقدس
رہی ہے صبح تک روشن
صمیم قلب سے مانگو دعا
تم اے پیمبر!
خیالات پشیماں دور رکھو
پریشاں خواب سے بیدار ہو جاؤ

''تمہاری غار'' کوہ حراء کی غار ہے جہاں بہت طویل عرصے تک پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وسلم عبادت کرتے رہے تھے، جہاں 610 عیسوی میں رمضان کی 24 تاریخ سے اللہ کے حکم سے فرشتہ جبریل ان کے پاس ''آسمانی کتاب'' کے الفاظ لے کر آیا تھا۔

محمد ﷺ نے بھی صحرا کے سیانوں کی طرح کہا تھا ''میں جب اکیلا ہوتا ہوں تو اللہ کے ساتھ ہوتا ہوں۔'' پشکن نے لیسیا کی لکھی ''طالبعلم کا حجرہ'' پڑھی تھی جس میں لکھا تھا کہ ''ننھے نے حجرے میں اپنا دل محفوظ رکھ دیا تھا۔'' پشکن نے غار میں شمع کا ذکر اسی تناظر میں کیا ہے۔ نظم ''تمثیل قرآن'' کی یہ سطریں ملاحظہ کیجیے:

غیض کے دن،
میں تھا چھپی ہوئی غار میں
یکا یک آ گیا کروبیاں دینے تسلی
مجھے جادو اثر آیات دے دیں
تھی جن میں ایک پر اسرار قوت
مقدس لفظ دمکنے لگ گئے تھے

نظم کا آٹھواں حصہ ''یتیموں سے پیار'' سے متعلق ہے جو اولیں اشعار کا تسلسل ہے جس میں کئی سورتوں کی آیات کا لب لباب ہے۔

حضرت موسیٰ اور محمد ﷺ دونوں ہی یتیمی کا شکار ہوئے تھے۔ موسیٰ کی والدہ سے کہا گیا تھا، ''جلدی کرو، اس سے پہلے کہ کوئی دیکھ لے اسے دریا میں بہا دو۔ ڈرومت اور حزیں مت ہو۔ ہم اسے تمہارے پاس واپس لائیں گے اور اسے اپنا رسول بنائیں گے۔'' محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے والد ان کی پیدائش سے پیشتر ہی انتقال کر گئے تھے۔ چھ ماہ کے بچے تھے کہ انہیں پالے پوسے جانے کی خاطر بدوؤں کے ایک قبیلے میں بھیج دیا گیا تھا۔ چھ برس کے تھے کہ ماں کے سائے سے بھی محروم ہو گئے تھے۔

زکوٰۃ ہو یا صدقہ، یہ یتیموں اور عسیروں کے لیے نہ تو رحم ہے اور نہ مہربانی بلکہ یہ بھائی بندی کا معاوضہ ہے۔ زکوٰۃ کمزوروں اور بے مایہ لوگوں کا ثروت پر حق ہے۔ انسان کی جائیداد اور ثروت اللہ کی دی ہوئی ہے: ''اگر ان سے متعلق علم ہے تو اپنی ثروت میں سے، جو اللہ نے تجھے دی ہے، جو چاہے ان کو دے دے۔'' صدقہ مہربانی کے الفاظ بھی ہو سکتے ہیں، دکھ میں شریک ہونا بھی ہو سکتا ہے، کسی بھی نوع کی امداد اور خدمت بھی ہو سکتی ہے۔ ''اس لیے غریبوں کے پاس بھی صدقہ کرنے کے امیروں کی نسبت کچھ کم امکان نہیں ہیں۔ اس حوالے سے امیر

غریب برابر ہیں۔''

نظم ''تمثیل۔۔۔'' کا نواں اور آخری حصہ قرآن کی دوسری سورت کے بارے میں ہے۔اس میں مسافر کے دکھ سے متعلق ہے۔وہ جو اللہ کی راہ میں سفر کرتا ہے،اس پر مہربانی کرنا زمین آسمان پانے کے برابر ہے۔''

تب ہوا صحرا میں ایک معجزہ
ماضی کو نیا رنگ ملنے کی توقع تھی
کھجوروں کے درخت ہرے ہو گئے
کنوؤں میں پھر سے پانی بھر گیا
مسافر میں سکت آئی، ہوا خوش
رگوں میں خوں جوانی کا بھی دوڑا
بھرا سینہ مقدس خواہشوں سے
لیا نام خدا اور چل پڑا پھر سے

پشکن نے اسلام کے موضوع کو ترک نہیں کیا تھا۔ان کے فن سے اس کی ایک اور مثال یوں ہے۔

کفار مکہ کا کہنا تھا کہ قرآن اصل میں محمد (صلی اللہ وعلیہ وآلہ وسلم) کی اپنی کی ہوئی شاعری ہے۔اس بارے میں اللہ کی جانب سے آیت نازل ہوئی: ''ہاں وہ کہتے ہیں کہ وہ دروغ گو ہے۔اس نے یہ سب خود سوچا ہے۔وہ شاعر ہے۔'' پشکن کے لفظوں میں:

سناتا ہے یہ ساری من گھڑت باتیں
بکار خویش یہ ہشیار احمد
ہم اس کی داستانیں نہ سنیں گے
یہ شاعر ہے یونہی کہتا ہے سب کچھ

ہاتھ سے لکھی گئی نظم ''یوگینیا انیگینا'' میں کچھ سطریں یوں تھیں:

قرآن میں بہت سی عقلی فکر ہے
کہ جیسے،رات کو سونے سے پہلے
تو دعا بھی کر لیا کر
بری سوچوں سے تاکہ دور ہو تو
خدا کا نام لو
اور احمق شخص سے نہ الجھو،

پشکن کی نظم ''پیغمبر'' کی کچھ سطریں یوں ہیں:

اس نے خنجر سے مرا سینہ چیرا
اور دھڑکتے دل کو نکالا
پھر سینے میں
ایک بھڑکتا انگارہ بھر ڈالا

یہ سطریں بھی قرآن کی ایک سورت سے ہیں: ''کیا ہم نے تمہارا سینہ کھول نہیں دیا اور تمہارے دل سے کدورت نکال باہر کی۔'' حدیث نبوی بھی ہے کہ فرشتے نے میرا دل نکال لیا،اسے برف سے دھویا اور پھر واپس سینے میں رکھ دیا۔

اور آخر میں نظم کا وہی حصہ کہ ''پیغمبر، اٹھ کھڑے ہو۔۔۔'' جس میں نظم ''تمثیل قرآن'' کے ساتویں حصے میں اللہ جل شانہ پیغمبر سے مخاطب ہوتا ہے، کی کچھ اور سطریں:

میں لاش کی مانند صحرا میں پڑا تھا
پر میں نے صدائے لم یزل سنی تھی
''اٹھ کھڑے ہو پیغمبر، سنو اور دیکھو
میری راہ پہ چلتے ہوئے
لوگوں کے دلوں میں
میرا دیا پیغام بھرو''

پشکن نے خود کو پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے راز ''افشاء کرنے والا'' کہا تھا، جو خالق جہاں کے آخری نبی تھے اور جو پہلے پیغمبر تھے جنہوں نے اسلام کو عالمی مذہب قرار دیا تھا۔

مسلمانوں کی اندلس میں کامیابی سے زوال تک کی تاریخ

عامر حسین

تاریخ پر نظر ڈالنے سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ پہلی صدی ہجری کی آخری دہائیوں میں اموی فوجیں موسیٰ بن نصیر کی قیادت میں شمالی افریقہ کے اکثر علاقوں پر قابض ہو چکی تھیں۔افریقہ کے شمالی اطراف کے ساحلی حصے سلطنت روما سے تعلق رکھتے تھے لیکن قرطاجنہ کے سقوط سے افریقہ میں رومی سلطنت کی طاقت ختم ہو چکی تھی۔تاہم شمالی افریقہ کا ساحلی شہر سبتہ بدستور رومی سلطنت کا حصہ تھا۔سبتہ کا حاکم جولیان قوطیہ، بادشاہ سپین وی تیزا کا داماد اور خاص آدمی تھا۔رزریق بادشاہ وتیزااور اس کے ولی عہد کے قتل کے بعد تخت پر بیٹھ گیااور اپنے ظلم کی وجہ سے بہت جلد مشہور ہوا۔جس کی بدولت بہت سے لوگ ہجرت کر کے افریقہ کے ساحلی شہروں میں پناہ لینے لگے۔

مسلمانوں کی اُندلس میں کامیابی سے لے کر زوال تک کی تاریخ کو ہم مختلف ادوار میں تقسیم کر سکتے ہیں جس کی مختصر تفصیل درجہ ذیل ہے۔

(1):اموی امراء کا دور(711تا756)

(2):اموی امراءاور خلفاء کا دور(756تا912)

(3):ملوک الطوائف(1023تا1091)

(4):المرابطون،الموحدون(1091تا1269)

(5):بنواحمر(1232تا1492)

(6):زوال غرناطہ

اموی امرا کا دور(711تا756)

سبتہ کا حاکم جولیان قوطیہ، بادشاہ سپین وی تیزا کا داماد اور خاص آدمی تھا۔رزریق بادشاہ وتیزااور اس کے ولی عہد کے قتل کے بعد تخت پر بیٹھ گیااور اپنے ظلم کی وجہ سے بہت جلد مشہور ہوا۔جس کی بدولت بہت سے لوگ ہجرت کر کے افریقہ کے ساحلی شہروں میں پناہ لینے لگے۔

جب710ء میں موسیٰ بن نصیر کا ایک سپہ سالار طریف اس راستے سے سپین میں داخل ہونے لگاتو جولیان نے ان کی بڑی مدد کی تھی۔جب موسیٰ کا دوسرا سپہ سالار طارق بن زیاد ۷۱۱ء میں ساحل پر اترا(جبرالٹر)اور حملوں کا آغاز کر دیاتو19 جولائی 711ء کو وادی لطہ میں انھوں نے بادشاہ رزریق کو شکست دے دی۔اس کے بعد تیزی سے بڑھ کر دوسرے شہروں پر قبضہ کر لیااور711ء میں قرطبہ اور طلیطلہ فتح ہوئے۔اسی طرح712ء میں اشبیلیہ،ماردہ اور سرقسطہ بھی فتح ہو گئے۔

یوں اسپین اموی خلافت کا باقاعدہ حصہ بن گیا۔اس دور میں اسپین کی مقامی ثقافت اور اسلام کی شامی تہذیب کے امتزاج سے مذہبی

رواداری بڑھی اور تجارت کو بہت فروغ حاصل ہوا البتہ معاشرت کی بنیاد قبائلی تقسیم پر رہی۔ اس لئے عرب شامی اور غیر شامی تفریق کا شکار تھے۔ اس عہد کا ایک قابل ذکر واقعہ بلاط الشہداء کی جنگ ہے۔ جسے یورپ کے مورخین نے ایک اہم واقعہ بتایا ہے۔

آخری اموی ولی یوسف بن عبد الرحمن الفہری (747ء-756ء) تھا جب عباسیوں نے اموی خلافت کے خاتمے کے بعد 756ء میں عباسی خلافت قائم کی۔ ابو العباس عبد اللہ اس کا پہلا خلیفہ بنا۔ تو ایک اموی شہزادہ عبد الرحمن بن معاویہ عباسیوں سے بچتا بچاتا شمالی افریقہ پہنچ گیا۔ یہاں اس نے فوج جمع کی اور اسپین پر حملہ کیا اور قرطبہ کے باہر الفہری کو شکست دے کر 10 مئی 756ء کو اس نے امیرِ اندلس ہونے کا اعلان کیا اور اموی امارت کے دور کا آغاز ہو گیا۔

طارق بن زیاد کے وقت سے لے کر یوسف بن عبد الرحمن تک یعنی 711ء سے 756 تک کے عرصے میں یہ ملک صحیح معنوں میں اسلامی اندلس بن گیا۔ اس نصف صدی کا زیادہ تر وقت گو کہ خانہ جنگی میں گزرا لیکن پھر بھی یورپ کی سرزمین پر اسلام کی کرنیں چمکنے لگی۔ اس دور کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ''اندلس اسلامی حکومت کے زیر سایہ پچاس سال کے اندر اندر تہذیب کے اس نقطہ پر پہنچ گیا۔ جہاں تک اٹلی کو پوپ کی حکومت کے ماتحت پہنچنے میں ایک ہزار برس لگے۔''

اس دور کے بارے میں ڈاکٹر عبد الرؤف لکھتے ہیں کہ ''پہلا دور بوکھلاہٹ اور انتشار کا دور تھا اور دوسرا دور طاقت اور ترقی کا دور شمار ہوتا ہے جب کہ تیسرا دور ناخوشگوار لاقانونیت اور بربادی کا دور کہلایا جاتا ہے۔''

ڈاکٹر عبد الروف پہلے دور کے بارے میں ایک جگہ لکھتے ہیں:
''بدقسمتی سے مسلمان سپین میں صحیح طور پر حکومت کرنے میں ناکام ہوئے اس کے باوجود کہ مسلمانوں کے پاس سائنس کے ساتھ ساتھ ایک عمدہ تہذیب بھی موجود تھی لیکن اندرونی انتشار اور سازشوں کی وجہ سے وہ بغاوت کو ختم کرنے میں ناکام ہوئے۔ آگے بڑھ کر وہ اس دور کی چند خوبیاں بھی بیان کرتے ہیں کہ باوجود اس

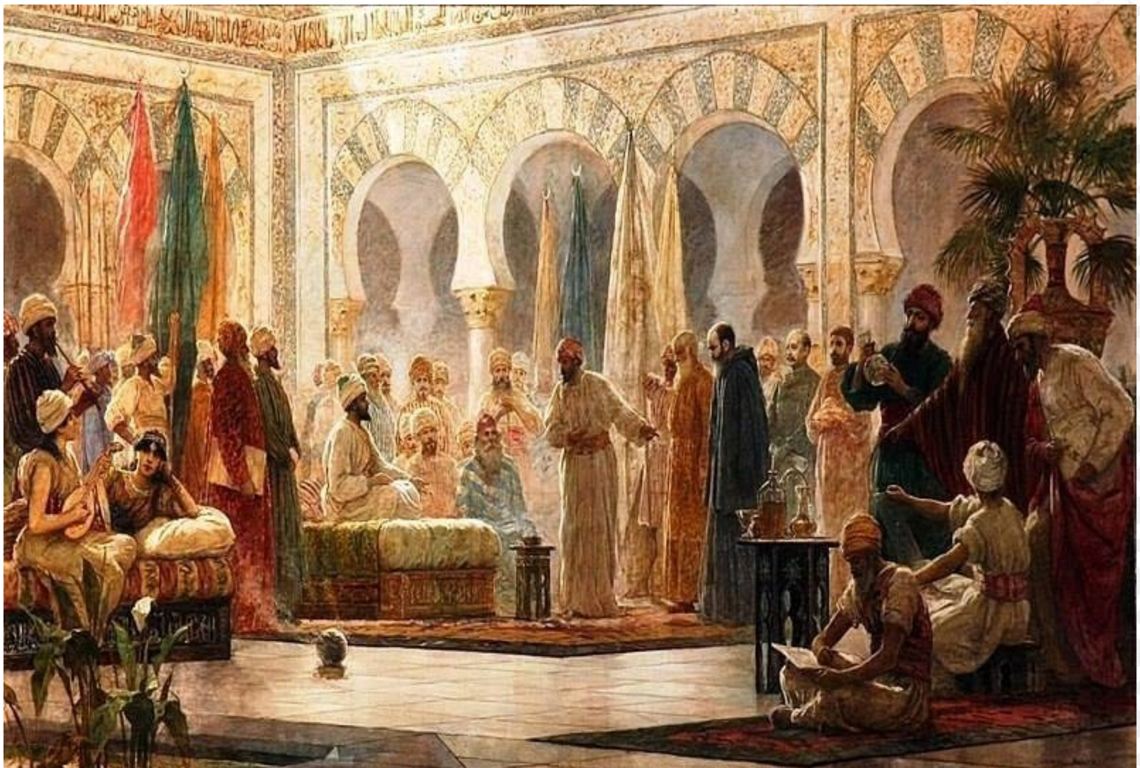

انتشار اور غیر یقینی حالات کے مسلمانوں نے فرانس کا کافی علاقہ قبضہ کیا تھا۔"

بالآخر اندلس کا دور ولایت بہت سے مشکلات کے باوجود اچھا رہا۔ اکبر شاہ خان نجیب آبادی اس دور کے بارے میں لکھتے ہیں۔ اس پچاس سال کے عرصے میں سپین نے سائنس اور فنون عامہ میں وہ کامیابیاں حاصل کی جس سے اس دور کی ترقی ظاہر ہوتی ہے۔

اگر ہم اندلس کی اسلامی حکومت پر نظر ڈالیں تو ہر طرف ترقی ہی ترقی نظر آئے گی۔ ہر شعبہ میں مسلمانوں نے کافی ترقی کی اور صرف مسلمان نہیں مغربی مصنفین بھی اسکے قائل ہیں۔ مسیحی یورپ نے اسلام کی علمی و ثقافتی سرگرمیوں کا موازنہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔ "جو نہی عربوں کو اسپین میں مضبوطی سے قدم جمانے کا موقع ملا وہیں انہوں نے ایک روشن دور کا آغاز کر دیا۔ قرطبہ کے امیروں نے خود کو علم و ادب کا سرپرست بنا کر ممتاز کر لیا اور ذوق سلیم کی ایک ایسی مثال قائم کر دی جو یورپ کے دیسی شہزادوں کی حالت کے بالکل عکس تھی۔"

اسلام کے دشمنوں نے جہاں اپنی تمام تر کوششیں اسلام کے انہدام کے لیےء صرف کیں۔ وہاں وہ بھی اللہ تعالی کے آخری اور پسندیدہ دین کی صداقت کا اعتراف کرنے پر مجبور ہوئے۔ سر ایڈورڈ ڈینی راس۔ سی آئی۔ ای کہتے ہیں۔

"قرآن شریف اس بات کا مستحق ہے کہ یورپ کے گوشہ گوشہ میں اسے پھیلایا جائے"۔ اسطرح حضور ﷺ کی تعریف میں بھی وہ خود کہتے ہیں کہ "عرب میں حضرت محمد ﷺ نے ایک مذہب توحید کی بنیاد ڈالی جس نے آگے چل کر پورے عالم انسانی کے ساتویں حصہ کو اپنا حلقہ بگوش بنالیا"۔

الغرض ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہوں گے کہ دسویں صدی میں جن لوگوں کو علم کا شوق ہوتا تو وہ اسپین پہنچتے تھے۔ ان دنوں قرطبہ تعلیم کے شعبے میں آگے آگے تھا اور ساتھ ساتھ ان دنوں میں ایران اور عراق نے بھی اسلامی حکومت کے زیر اثر کافی ترقی کی تھی۔ اسلامی حکومت کا ہر شعبہ ہم کو ایک ماہر اہل علم و فنکار عطا کرتا ہے۔ منطق و فلسفہ میں ہم کو ابو یوسف یعقوب ابن اسحق الکندی، ابوالعباس احمد بن الطیب السرخسی، ابو نصر الفارابی، ابن رشد وغیرہ ملتے ہیں۔ طب میں ہم کو ابو بکر محمد بن زکریا الرازی، ابو منصور، شیخ بو علی سینا، ریاضی میں ہم کو محمد بن موسیٰ الخوارزمی، ابراہیم بن سنان وغیرہ، ہیئت میں محمد بن ابراہیم الفزاری، یعقوب بن طارق وغیرہ، جغرافیہ میں ابو الحسن المسعودی، المقدس، تاریخ میں ابن اسحاق، ابن ہشام، ابن خلدون وغیرہ کا ذکر ملتا ہے۔

اس مختصر فہرست سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اپنے دور حکومت میں مسلمانوں نے اندلس کو چار چاند لگائے اور وہاں کے بنجر زمینوں میں کیسے گل بوٹے کھلائے۔ لیکن اندلس نے ان احسانات کا اعتراف نہ کیا اور مسلمانوں کو دیس سے نکالا۔ ان کے علوم و فنون کو آگ میں جلا ڈالا۔ صرف ایک دن اور ایک جگہ 80 ہزار کتابیں جلائی گئیں۔ الغرض سکے، زراعت، صنعت، تعمیراتی کام، زیورات، غذا، فوجی نظام، تعلیمی مراکز، ان سب میں آج بھی اسلامی رنگ کچھ نہ کچھ ضرور دکھائی دے رہا ہے اور جب بھی عربوں نے مختلف قوموں سے میل جول کیا تو ان کی عمارتوں نے بھی ان کے ذہنوں کو متاثر کیا۔ مختلف زمانوں میں اسلامی طرز تعمیر نے مختلف شکلیں اختیار کیں لیکن جغرافیائی اختلافات کے باوجود اسلامی طرز تعمیر میں ایک خاص تسلسل پایا جاتا ہے جو اُن کے عقیدہ وحدانیت کا نتیجہ ہے اور جس پر زمانے اور فاصلے کا کوئی اثر نہیں پڑا۔

مرزا غالب محض شاعر نہیں مفکر بھی ہیں

محمد سلمان

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

غالبؔ نے اردو غزل گوئی میں اپنا الگ مقام بنایا وہ دوسروں کی راہ پر چلنے سے کتراتے تھے۔ ابتداء میں فارسی میں شاعری کرتے رہے۔ بعد میں اردو شاعری کی۔ غالب کا اردو دیوان مختصر ہے۔ لیکن اسے عالمی طور پر مقبولیت حاصل ہوئی۔ موضوعات اور انداز بیان میں جدت' شوخی' ظرافت اور دیگر زبان و بیان کی خوبیاں انہیں اردو کا ایک منفرد شاعر بناتی ہیں۔ غالبؔ نے بغیر القاب وآداب استعمال کئے آپسی گفتگو کی طرح خط لکھے جو بہت مشہور ہوئے۔ مجموعی طور پر غالب نے اردو شاعری کو نئی فکر عطا کی اور آج بھی ان کی شاعری سے نئے مفاہیم تلاش کئے جارہے ہیں۔

اردو شاعری میں مرزا غالب کی حیثیت ایک dرخشاں ستارے کی سی ہے۔ انہوں نے اردو شاعری میں ایک نئی روح پھونک دی۔ اسے نئے نئے موضوعات بخشے اور اس میں ایک انقلابی لہر دوڑادی۔ ان کی شاعری میں فلسفیانہ خیالات جابجا ملتے ہیں۔ غالب ایک فلسفی ذہن کے مالک تھے۔ انہوں نے زندگی کو اپنے طور پر سمجھنے کی بھرپور کوشش کی اور ان کے تخیل کی بلندی اور شوخی فکر کا راز اس میں ہے کہ وہ انسانی زندگی کے نشیب و فراز کو شدت سے محسوس کرتے ہیں۔

غالب انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں کا گہرا شعور رکھتے ہیں۔ اس کے بنیادی معاملات و مسائل پر غور و فکر کرتے ہیں۔ اس کی ان گنت گتھیوں کو سلجھادیتے ہیں۔ انسان کو اس کی عظمت کا احساس دلاتے ہیں اس کو اپنے پیروں پر کھڑا ہونا سکھاتے ہیں۔ اور نظام کائنات میں اس کو نئے آسمانوں پر اڑاتے ہیں۔ غالب کی شاعری اس اعتبار سے بہت بلند ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ ان کی شاعری کے

انہیں عناصر نے اُن کو عظمت سے ہمکنار کیا ہے۔ لیکن جس طرح ان کی شاعری میں ان سب کا اظہار و ابلاغ ہوا ہے۔ وہ بھی اس کو عظیم بنانے میں برابر کے شریک ہیں۔ غالب کی شاعری کا اثر حواس پر شدت سے ہوتا ہے وہ ان میں غیر شعوری طور پر ایک ارتعاش کی سی کیفیت پیدا کرتی ہے اور اسی ارتعاش کی وجہ سے اس کے پڑھنے اور سننے والے کے ذہن پر اس قسم کی تصویریں ابھرتی ہیں۔ ان کے موضوع میں جو وسعتیں اور گہرائیاں ہیں اس کا عکس ان کے اظہار و ابلاغ میں بھی نظر آتا ہے۔ ان گنت عناصر کے امتزاج سے اس کی تشکیل ہوتی ہے۔

غالب کوئی باقاعدہ صوفی شاعر نہ تھے اور نہ اُن کو تصوف سے دلچسپی تھی لیکن پھر بھی ان کی شاعری میں بعض مقامات پر تصوف کے عناصر ملتے ہیں جس کی بنیادی وجہ فارسی شاعری میں تصوف کی روایت کی موجودگی ہے اس کے علاوہ اس دور کے حالات بھی تصوف کے لیے خاص طور پر سازگار تھے۔ طبعیتیں بھی غم و الم اور فرار کی طرف مائل تھیں۔ لیکن غالب نے تصوف کو محض رسمی طور پر ہی قبول کیا۔

غالب کی شاعری میں تشکک پسندی کا پہلو بہت اہم ہے۔ جو بحیثیت مجموعی غالب کی شاعری کے رگ و پے میں سرایت کئے ہوئے ہے۔ اس کی ایک وجہ غالب کا فلسفیانہ مزاج ہے۔ جبکہ دوسری وجہ غالب کا ماحول ہے۔ غالب نے جس دور میں آنکھ کھولی وہ ایک ہنگامی دور تھا۔ ایک طرف پرانی تہذیب مٹ رہی تھی اور اس کی جگہ جدید تہذیب اور تعلیم اپنی جڑیں مضبوط کر رہی تھی۔ یوں انتشار اور آویزش کے اس دور میں اُن کی تشکک پسندی کو مزید تقویت ملی۔

غالب کی شاعری میں نکتہ آفرینی پائی جاتی ہے غالب عام روش سے ہٹ کر چلنا پسند کرتے تھے۔ شاعری میں بھی الگ روش پر چلنا پسند کرتے تھے۔ انہوں نے لفظی سے زیادہ معنوی نکتہ آفرینی پر زور دیا۔ اس طرح وہ مومن سے ممتاز اور برتر ہیں۔ ان کی نکتہ آفرینی سلاست، گہرائی اور معنویت سے پُر ہے۔ اس میدان میں غالب نے نمایاں کامیابی حاصل کی ہے اس کی وضاحت اُن کے درج ذیل اشعار سے ہوتی ہے۔

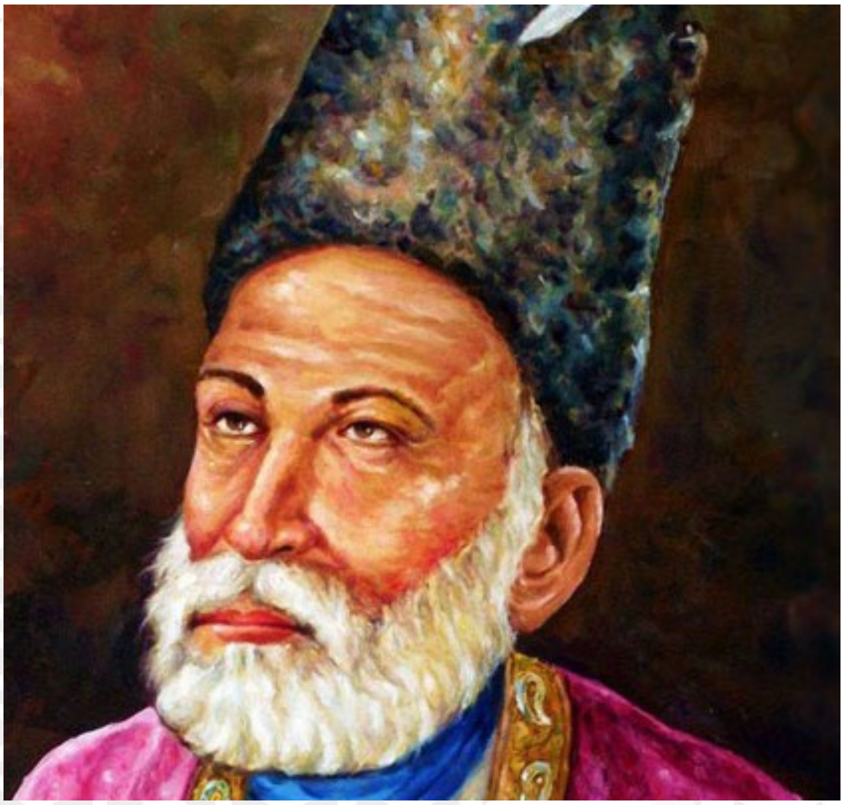

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے میرے ارماں لیکن پھر بھی کم نکلے

غالب کو فارسی زبان پر بڑا عبور حاصل تھا۔ اس لئے ان کی شاعری میں فارسی زبان کے اثرات زیادہ ہیں۔ خود فارسی شاعری کے بلند پایہ شاعر بھی تھے۔ اور فارسی کو اردو سے زیادہ اہمیت دیتے تھے۔ چنانچہ فارسی زبان کے اثر سے ان کی زبان میں شیرینی حلاوت اور شگفتگی کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔ انہوں نے فارسی الفاظ استعمال کرکے اور ان کی ترکیبیں تراش کرنہ

صرف اردو زبان کے دامن کو وسیع کیا بلکہ اپنی شاعری میں بھی ایک نکھار اور رعنائی پیدا کرلی۔

غالب نے فارسیت کے غلبے کے باوجود ایسا آہنگ تخلیق کیا جو ان کی شاعری کو ممتاز بناتا ہے۔

غالب کو ظاہر سے دلچسپی نہیں بلکہ وہ چیزوں کے اندرونی پراسس کو دریافت کرنا اور سمجھنا چاہتے ہیں۔ غالب کے دیوان کے اولین شعر 'نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا' اس کی مثال ہے غالب نے اس میں روح اور جسم کی دوئی کو عقل کے ذریعے پرکھنے کی کوشش کی ہے۔

غالب کے ہاں حسن و عشق کے تصورات اگرچہ وہی ہیں جو صدیوں سے اردو اور فارسی شاعری میں اظہار پاتے رہے ہیں۔ تاہم غالب کی فطری جدت پسندی نے ان کو صرف انہی موضوعات تک محدود نہیں رکھا بلکہ اپنے ذاتی تجربات و محسوسات کی روشنی میں حسن و عشق کے بارے میں انہوں نے اپنی انفرادیت قائم کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔

غالب کا کمال یہ ہے کہ وہ عقلی اظہار کے محض ظاہری پہلوؤں تک محدود نہیں رہتے بلکہ شعر کو فنی اعتبار سے جذباتی اظہار بنا دیتے ہیں۔

غالب محض شاعر نہیں بلکہ مفکر بھی ہیں جس نے برصغیر کی تاریخ کو نیا موڑ عطا کیا، کیوں کہ سرسید کو جدید بنانے والے غالب ہیں۔ یہ غالب ہی تھے جنھوں نے سرسید سے کہا تھا کہ تم کیا پرانے مقبروں میں جھانکتے پھرتے ہو، ذرا ان انگریزوں کو اور ان کی دخانی کشتیوں کو دیکھو کہ یہ کیا کر رہے ہیں۔

وزیر اعلیٰ سندھ سید مراد علی شاہ مقامی ہوٹل میں پاکستان سینٹر فار آٹزم کے زیر اہتمام
"آٹزم: موجودہ چیلنجز اور آگے بڑھنے کا راستہ" کے موضوع پر سیمینار سے خطاب کر رہے ہیں۔

وزیراعلیٰ سندھ سید مراد علی شاہ نے سینٹ جوزف کانونٹ اسکول کی تعلیم میں مسلسل ترقی اور عمدہ کارکردگی کے
160 سال مکمل ہونے پر ٹیبلٹ کا افتتاح کرنے کے لیے تختی کی نقاب کشائی کی۔

وزیراعلیٰ سندھ سید مراد علی شاہ کا پارٹی رہنماؤں کے ساتھ گروپ فوٹو جنہوں نے
وزیراعلیٰ ہاؤس میں ان سے عید کی مبارکباد کا تبادلہ کیا۔

وزیراعلیٰ سندھ سید مراد علی شاہ کی زیرصدارت محکمہ پولیس کا اجلاس وزیراعلیٰ ہاؤس میں ہوا۔

وزیر اعلیٰ سندھ سید مراد علی شاہ نے وزیر مملکت برائے پیٹرولیم ڈاکٹر مصدق ملک سے صوبے میں گیس کی لوڈشیڈنگ اور قلت کے مسائل پر تبادلہ خیال کیا جنہوں نے ان سے وزیراعلیٰ ہاؤس میں ملاقات کی۔

وزیراعلیٰ سید مراد علی شاہ سچل سرمستؒ کے مزار پر پھولوں کی چادر چڑھا رہے ہیں۔

سیکریٹری یونیورسٹی اینڈ بورڈز مرید رحیمو، سیکریٹری آئی ٹی آصف اکرام اور ٹیک ویلی اور گوگل پاکستان عمر فاروق کے ساتھ ایم او یو پر دستخط کیے تاکہ ٹیکنالوجی کے شعبے میں انسانی سرمائے کی ترقی کے لیے مختلف تربیتی کورسز کی پیشکش کی جائے۔ وزیراعلیٰ سندھ سید مراد علی شاہ، چیف سیکریٹری سہیل راجپوت اور دیگر نے وزیراعلیٰ ہاؤس میں تقریب دیکھی۔

وزیر اعلیٰ سندھ سید مراد علی شاہ نے سیلاب کے بعد کی امدادی سرگرمیوں پر تبادلہ خیال کرنے کے لیے انٹرنیشنل ریسکیو کمیٹی (IRC) کے سی ای او مسٹر ڈیوڈ ملی بینڈ (ویڈیو لنک کے ذریعے) سے ملاقات کی۔

فارسی شاعری میں سندھ کا تاریخی ذکر

محسن علی

اسلامی جغرافیا کی کتابوں میں جن سے فارسی آثار بی ماخوذ ہیں۔ سندھ کو مکران اور ہند کے درمیان واقع ایک علاقہ قرار دیا گیا ہے۔ مثلاً فارسی میں جغرافیے پر پہلی کتاب حدود العالم لطیف در ایام میں سندھ کا حدود اربعہ یوں بیان کیا گیا ہے:

سندھ دریائے مہران کے مشرق اور پائے کبیر کے جنوب کرمان کے مغرب اور بیابان کے شمال میں واقع ہے ہے۔

اسی کتاب میں ایک دوسری جگہ پر لکھا ہے؟ دریائے کبیر... ہندوستان اور سندھ کے شہروں کے پاس سے گزرتا ہے۔

اسی قسم کا اشارہ ایک اور جگہ پر بھی موجود ہے خلیج فارس، فارس کی حدود سے شروع ہوتی ہے اور کم چوڑائی کے ساتھ سندھ کی حدود تک چل جاتی ہے یا ہے۔

تقدیم زمانے میں سندھ کے اہم شہروں ملتان منصورہ، قردار کی شہرت خود سندھ جیسی تھی اور فارسی اللہ وادب کی کتب میں ان شہروں کا ذکر موجود ہے۔ ملا منصوری کہتا ہے۔

حکایت سفر مولتان می دانی
اگر ندانی تاج الفتوح پیش آور

ملتان کو اکثر سندھ کا دارالحکومت سمجھا جاتا رہا ہے۔ جیسا کہ ابن بطوطہ نے اپنے سفر نامہ میں لکھا ہے۔ اگرچہ نائی نے اپنے اشعار میں سندھ کا ذکر نہیں کیا لیکن ایک قصیدے میں وہ قردار کا ذکر یوں کرتا ہے.

شنیدمی کہ ہمی در نواحی قزدار
ستارہ از تف او در ہوا بیالاید۔

مذکورہ بالا علاقے پر لفظ سندھ کے اطلاق کا ذکر صرف تاریخی، جغرافیائی اور عجائب کی کتب ہو سکے ہی میں نہیں ہوا بلکہ فارسی اشعار میں بھی وہ کئی صورتوں میں استعمال ہوا ہے۔ فارسی شعراء کے نقطہ نظر سے اس کا جغرافیائی مفہوم خاص اہمیت کا حامل ہے۔ ہم اسی پر یہاں بحث کریں گے تاہم یہ بحث سعدی شیرازی کے عہد تک ہی محدود ہے۔

سندھ کا فارسی اشعار میں دو مناسبتوں سے ذکر ہوا ہے۔ ایک تاریخی واقعات، جنگ و جدال اور ان بادشاہوں اور سرداروں کی فتوحات کی مناسبت سے جو یہاں آئے تھے۔ فرخی عنصری، مسعود سلمان، ابوالفرج روتی اور مختاری کے قصائد میں ایسی مثالیں مل جاتی ہیں۔ دوسرے وہ اشعار میں جن میں لفظ سندھ کا استعمال اپنی وسعت جغرافیائی اہمیت اور الگ قوم کی حیثیت سے ہوا ہے۔ بہر حال فارسی شاعری میں سندھ کا ذکر چار اسباب (یا حیثیتوں) سے پایا جاتا ہے:

اسندھ کی سرزمین۔ ۲۔ سندھ کے لوگ 3۔ دریائے سندھ 4۔ سندھ سے نسبتہ سیاسی جغرافیے کی رو سے سندھ ایک الگ مملکت اور سر زمین ہے۔ جو طبیعی اور ارضی جہات سے روم، روس اور سرازیپ کے ہم پلہ شمار ہو سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر شعراء کے ہاں سندھ کا ذکر ہند کے مقابل ملتا ہے جس کی مطابقت سندھ کے بارے میں تاریخی اور جغرافیائی کتب میں درج روایات سے بھی ہو جاتی ہے۔ وہ اس مفہوم میں کہ سندھ اور ایک ایسا علاقہ ہے جس کا ذکر ہندوستان کے مثیل (و مقابل) کی حیثیت سے ہوا ہے۔ بلکہ اکثر ماخذ یں ان دونوں ناموں کا ذکر ترازو کے دو پلڑوں کی طرح یکساں طور پر پایا جاتا ہے۔

ہمارے خیال میں پہلا شعری ماخذ جس میں سندھ کا ہند کے مقابل ذکر ہوا ہے۔

دقیقی (م ۳۷۰ھ) کا شعر ہے:

شہ بر برستان د شاہان ہند
گزنیش بدادند و شاہان سند

شاہنامہ فردوسی میں بھی ایسا تقابل ہوا ہے جس پر سہارے دوست محمد علی اسلامی ندوشن نے تفصیل سے بحث کی ہے۔ سلطان محمود غزنوی کے درواح شعراء نے ان دو علاقوں کا ذکر اپنے اسلاف سے بہتر انداز میں کیا ہے۔ یہ دو شاعر فرضی رم ۲۲۹) اور عنصری (م ۴۳۱ھ) ہیں عنصری نے سلطان محمود کی ہند اور سندھو میں فتوحات کی مناسبت سے جو قصیدہ لکھا اس کا یہ شعر یا خط ہو۔

سند و ناحیت ہند شہر یار آن کرد
کجا بہ مردم خیبر نکردہ بد حیدر

صاف ظاہر ہے کہ شاعر کے نزدیک سندھ کا علاقہ کوئی ایسی سرزمین نہیں ہے جسے وہ عرفاً ہند کے علاوہ مجھے۔ عنصری اور فرخی جن کے زمانے میں سلطان محمود کو فتوحات نصیب ہوئی تھیں شہراء کے اس طبقے سے تعلق رکھتے ہیں جنہوں نے اپنے زمانے میں مروجہ اصطلاح پر نظر رکھتے ہوئے یہ مضمون باندھا ہے۔ عنصری کا دوسرا شعر ملاحظہ ہو۔

چود وہی کہ بدونیک وقف بود برد
بہ زنگبار و بہ ہند و بہ سند و چالنور

عنصری سلطان محمود کی مدح میں ایک دوسرے قصیدے میں بحر ہند کا ذکر کرتے ہوتے ایک دشت کو سندھ کی سرحد قرار دیتا ہے۔

یکی بیابان بود اندر آن نواحی صعب
کہ بود پہنایش از رُودِ ہند تا مندآن

سلطان محمود کی مدح میں قصیدہ رائیہ کے ایک شعر میں عنصری نے ہند اور سندھ کا متوازی متوازی نام لیا ہے۔

بہ سند و ہند زعکس رخ ہر تمیانش
مر ارغوان رانتوان شناختن ززریرہ

فرخی نے بھی سندھ کا ذکر کرتے وقت عنصری کے بیان کردہ جغرافیائی مفہوم کو مدنظر رکھا ہے مثلاً سلطان محمود کی ہندوستان سے واپسی پر دوسری فتح کے موقع پر وہ کہتا ہے بشرطیکہ فرخی کا مطبوعہ دیوان صحیح ہو:

شنیدہ ام کہ فرامرز رستم اندر سند
بکشت مارو بدان فخر کرد پیش تیار
تو پادشاہ یکی گرگ کشتی اندر ہند
چنیں دلیری نیکو ترست از آن صد بار

فرخی امیر ابو یعقوب یوسف غزنوی کی طرح میں ایک قصیدے میں کہتا ہے۔

گفتگوتی است بہ ہند گفتگوئی است بخند
گفتگوئی است بہ روم و گفتگوئی است چین

اس شعر سے پتہ چلتا ہے کہ شاعر نے روم، چین، ہند اور سندھ کا چار الگ الگ جغرافیائی علاقوں کی حیثیت سے ذکر کیا ہے اور اس کے پاس ایسی کوئی دلیل نہیں تھی جس کی بناء پر وہ سندھ اور ہند کے ایک ہی ملک ہونے کی صورت میں ان دونوں کا روم اور حنین کے مقابلہ میں ذکر کرتا۔ فتح سومنات سے متعلق ایک قصیدے میں فرخی پھر کہتا ہے:

بہ سند و ہند کسی نیست ماندہ کان ارزد
گز آن تو شود آنجا بہ جنگ یک چاکر

اسدی طوسی (م ۴۶۵) کے ہاں بھی ہند اور سندھ کا ایک الگ جغرافیائی مفہوم پایا جاتا ہے۔ گرشاسب کی ہندوؤں کے ساتھ جنگ کے بارے میں اس کے قصیدے کا یہ شعر:

کشیدند شمشیر شیران ہند
گرفتند کوشش دلیران سندن

یا

شنیدی کہ در کاول و مرزسند
چہ کردم چہ در خاور و روم ہند

یا

پزشکی بد از فیلسوفان ہند
کہ گرشاسب آوردہ بودش زمند

یا

د لیک از دگرہ شناسان ہند
شنیدم ہم از فیلسوفان سند

مذکورہ آخری شعر می ہم از فیلسوفان سند سے یہ وضاحت ہوتی ہے کہ مرہ شناسان ہند، اور فیلسوفان سند دو مختلف سرزمینوں سے تعلق رکھتے ہیں اور سب ان کی (الگ الگ) خصوصیات سے آگاہ تھے۔ اسدی اپنے ایک دوسرے مصرعے میں

مزید وضاحت سے کہتا ہے:

شناسند مکیسریم، ہند و سند

ناصر خسرو نے مغرب کا سفر کرنے سے پہلے ملتان کا سفر کیا تھا اور بظاہر وہ سرزمین سندھ سے واقف تھا لہذا وہ بھی ہند اور سندھ کا امتیازی حیثیت سے ذکر کرتا ہے۔

بہ پیغمبر، عرب یکسر مشرف گشت بہ مردم
زترک درد درس ہند سند گیلی

ناصر خسروا اپنے ایک دوسرے شعر میں سندھ کے سفر کی وضاحت کرتے ہوئے کہتا ہے:

بہ نداخت گاہم گربہ مغرب
چنین ہرگز ندید ستم فلاخن

اگر ہم ناصر خسرو کے اول الذکر شعر میں سندھ ہند کو ترک گیلی اور ویلم کے ساتھ لطیف کی مناسبت سے اقوام کی طرف اشارہ سمجھیں تو یہ بجائے خود اس امر کی دلیل ہے کہ مشرق میں سندھ اور ہند کے باشندوں کو مختلف سمجھا جاتا تھا۔ خواہ قومیت کے لحاظ سے خواہ جغرافیائی لحاظ سے۔ اہم نکتہ یہی ہے کہ ایرانی شعراء، ہندی اور سندھی اقوام میں تمیز کے قائل رہے ہیں۔ جیسا کہ ناصر خصرو کے ایک دوسرے شعر میں واضح طور پر اس امتیاز کی طرف اشارہ کیا گیا ہے:

از پارسی و تازی روز ہندی و زترک
وزسندی و رومی و رعبری ہمہ یکسر

ناصر خسرو ہی کے ایک دوسرے قصیدے کا شعر ملاحظہ ہو:

بخواہد خورو مر پروردگان خوشی راگیتی
نخواہد ستن ازچنگال اوسندی و زہندی

ناصر خسرو کے بعد مصری (م 520ھ) نے سنجر کے ہاتھوں فتح غزنین کی مناسبت سے جو قصیدہ لکھا ہے اس میں بھی سندھ کی الگ جغرافیائی حدود کی نشاندہی ہوتی ہے:

از ناحیت سندکینون تابہ درہند
بس کس کہ ازیں رنج بہ وردست بہ تیا

بہرام شاہ کی مدح میں معزی کے دوسرے قصیدے میں مزید وضاحت کے ساتھ کہا گیا ہے:

بہ زمین ہندو سندا زہیبت شمشیر او
شیر غزندہ نگرو ریک زمان غایب زغاب

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ سندھ سے کبھی سرزمین سندھ مراد لیا گیا ہے اور کبھی دریائے سندھ، معزی کے معاصر ابوالفرج روتی نے غزنوی عہد کے سپہ سالار ابو حلیم زریر شیبانی کی مدح میں جو قصیدہ لکھا ہے اس میں سندھ سے مراد دریائے سندھ ہے:

آنکھ آسیب تیغ او برسید
ازلب سندتا بہ دریا بار

یہاں "دریابار" سے مراد دریائے سندھ کا کنارہ ہے۔

فرخی جو معزی سے ایک سو سال پہلے کا شاعر ہے امیر یوسف سپہ سالار کی مدح میں ایک قصیدے میں یوں کہتا ہے:

رایت تو سایہ فلکنست بردریای سند
کی بود شاہا کہ سایہ افکند بر کوہ شام

فرخی کے یہ دو اشعار بھی ملاحظہ ہوں:

ای برون آوردہ اندکشور ہندوستان
پیل جنگی ازحصار وگرگ پیل انکن زغیل
ژندہ پیلان گزدردریای سند آوردہ ای
سال دیگر بگزرانی ازلب دریای نیل

اسدیؒ گرشاسب نامہ میں کہتا ہے:

ہمہ کشورروم تابوم ہند
بہ ہم برزدم تابہ دریای سند

اس شعر سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ شاعر دریائے سندھ کو ہندوستان کی سرحد سمجھتا ہے۔

مسعود مسلمان نے ہندوستان میں طویل عرصہ قیام کے باوجود سندھ کا صرف ایک بار ہی ذکر کیا ہے شمشیر شاہ کی مدح میں اُس کے قصیدے میں یہ شعر موجود ہے:

ریان ہند راوہشوبران سندرا
دربیشہ ہابیاب وبہ یک جانثار کن

عثمان مختاری نے سلطان مسعود ثالث کی طرف سے نامزد والی سندھ عمید محمد بن خطیب (سنائی کا محدوح) کی مدح میں جو قصیدہ لکھا ہے اسی کا یہ شعر ہے:

بہ ہندو سند بروتاختن چرابر بہار
بجای آب ہمی خون برانی اندربحر

اسی قصیدے کے یہ دو اشعار بھی ہیں:

ترابہ عالمی سند تہنیت چہ کنم
کہ آن ہز کہ شدہ است ازتو وزما سمر
ہمہ ممالک مشرق سپردہ گیر بہ تو
چوہند بر تو نبشتند سند راچہ خطر

آخری شعر کا دوسرا مصرعہ اس امر کی دوسری دلیل ہے کہ قدماء کے بقول سندھ ایک الگ علاقہ تھا۔ اور ہندوستان کا عمل دخل محمد بن خطیب ہی کو دینے سے دریائے سندھ کے کنارے پر واقع علاقہ کو جو خطرہ لاحق تھا وہ سندھ کی نسبت سوچا نہیں گیا۔ یعنی موجود اصطلاح کے مطابق شاعر نے سند اور ہند کو جغرافیائی لحاظ سے الگ الگ مملکتیں سمجھا

گوپی چند نارنگ-اردو زبان و ادب کے بادشاہ

مہوش اویس

اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ اُردو زبان ہماری صدیوں کی تہذیبی کمائی ہے اور یہ گنگا جمنی یعنی مشترکہ تہذیب کی دین ہے جس میں ہندوستانی تہذیب و ثقافت موجود ہے۔ جو انسان اپنی تہذیب و ثقافت کھو بیٹھتا ہے یا اپنی تہذیب و ثقافت کو بھول جاتا ہے تو وہ انسان گونگا، بہرا اور بے ادب ہو جاتا ہے۔ نارمگ صاحب کی نظر میں تاج محل کا کرشمہ مثالی ہے لیکن اُردو زبانوں کا تاج محل ہے۔اس ضمن میں گوپی چند نارنگ اپنے عالمانہ خیالات و تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اُردو ہماری صدیوں کی تہذیبی کمائی ہے، یہ ملی جلی گنگا جمنی تہذیب کا وہ ہاتھ ہے، جس نے ہمیں گڑھا، بنایا اور سنوارا ہے، یہ ہماری

ثقافتی شناخت ہے جس کے بغیر نہ صرف ہم گونگے بہرے ہیں بلکہ بے ادب بھی۔ میں نے بارہا کہا ہے کہ اُردو کو محض ایک زبان کہنا اُردو کے ساتھ بے انصافی کرنا ہے، یہ ایک طرز حیات، ایک اسلوبِ زیست، ایک اندازِ نظر یا جینے کا ایک سلیقہ و طریقہ بھی ہے، اس لیے کہ اُردو صدیوں کے تاریخی ربط وارتباط سے بنی ایک جیتی جاگتی زندہ تہذیب کا ایک ایسا روشن استعارہ ہے جس کی کوئی دوسری مثال کم از کم برصغیر کی زبانوں میں نہیں اُردو میری مادری زبان نہیں، میری ددھیال اور ننھیال میں سرائیکی بولی جاتی تھی، میری ماں دہلی ہجرت کے بعد بھی سرائیکی بولتی تھیں جو نہایت میٹھی، نرم اور رسیلی زبان ہے۔ لیکن مجھے کبھی محسوس نہیں ہوا کہ اُردو میری مادری زبان سے دور ہے۔ اُردو نے شروع ہی سے دوئی کا نقش میرے لاشعور سے مٹادیا۔ مجھے کبھی محسوس نہیں ہوا کہ اُردو میرے خون میں جاری وساری نہیں۔ یہ میں آج تک نہیں سمجھ سکا کہ اُردو میری ہڈیوں کے گودے تک کیسے اُترتی چلی گئی، یقیناً کچھ تو جادو ہوگا۔ تاج محل کا کرشمہ مثالی ہے، میں اُردو کو 'زبانوں کا تاج محل' کہتا ہوں اور اکثر میں محسوس کرتا ہوں۔ زبان میرے لیے رازوں بھرا بستہ ہے۔ کیسے ہند آریائی کے بستے میں عربی فارسی ترکی کے رنگ گھلتے چلے گئے اور کیسے ایک رنگارنگ دھنک بنتی چلی گئی کہ جنوبی ایشیا کے اکثر ممالک کے طول و عرض میں وہ آج 'لنگوافرینکا' بھی ہے اور ایک ایسا ادبی اظہار بھی جس کے رس اور بالیدگی کو دوسری زبانیں رشک کی نظر سے دیکھتی ہیں۔'' (اُردو زبان اور لسانیات، ص11و12)

ڈاکٹر گوپی چند ادب کو قدیم و جدید، ترقی پسند و غیر ترقی پسند کے دائروں میں قید کر کے نہیں دیکھتے۔ ادب میں نظریے کے وہ قائل ضرور ہیں، لیکن گروہ بندی سے ادیب کو بلند رکھنا چاہتے ہیں۔ وہ ادبی لیبل کو پسند نہیں کرتے۔ وہ جدیدیت سے کفر نہیں کرتے ان کی جدیدیت میں صرف انسان کے باطن کی نہیں بلکہ خارجی تقاضوں

کی شہادت بھی ملتی ہے۔ ان کی انھی اداؤں کے پیش نظر ڈاکٹر عبدالمغنی نے مزاحیہ اور لطیف انداز سے ایک ادبی نشست میں چٹکی لیتے ہوئے کہا تھا کہ نارنگ صاحب میں آپ کی بے رنگی کو خوب سمجھتا ہوں۔

ان کی تنقیدی بصیرت میں تہذیبی شعور کی کارفرمائی کے ساتھ ادبی جمالیات، لسانیات اور مابعد جدیدیت کا حسین امتزاج اور اس کے تانے بانے کی عکاسی صاف نظر آتی ہے۔ اور یہی چیز ان کو اردو کے دوسرے ناقدین سے ممتاز کرتی ہے۔ انھوں نے ادب میں مابعد جدید رجحانات کے ساتھ لسانیات اور اسلوبیات کی ہنرمندی کو خاص طور سے اپنی ادبی تنقید میں برت کر دِکھایا ہے۔ ان کے تنقیدی تصورات کے بنیادی حوالے میں زبان، اسلوب اور تہذیب و ثقافت بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔ جدید لسانیات نے ادب کے مطالعے میں جو نئی وسعت پیدا کر کے اس میں کئی راہیں نکالی ہیں ساختیاتی تنقید اور اسلوبیاتی تنقید کا

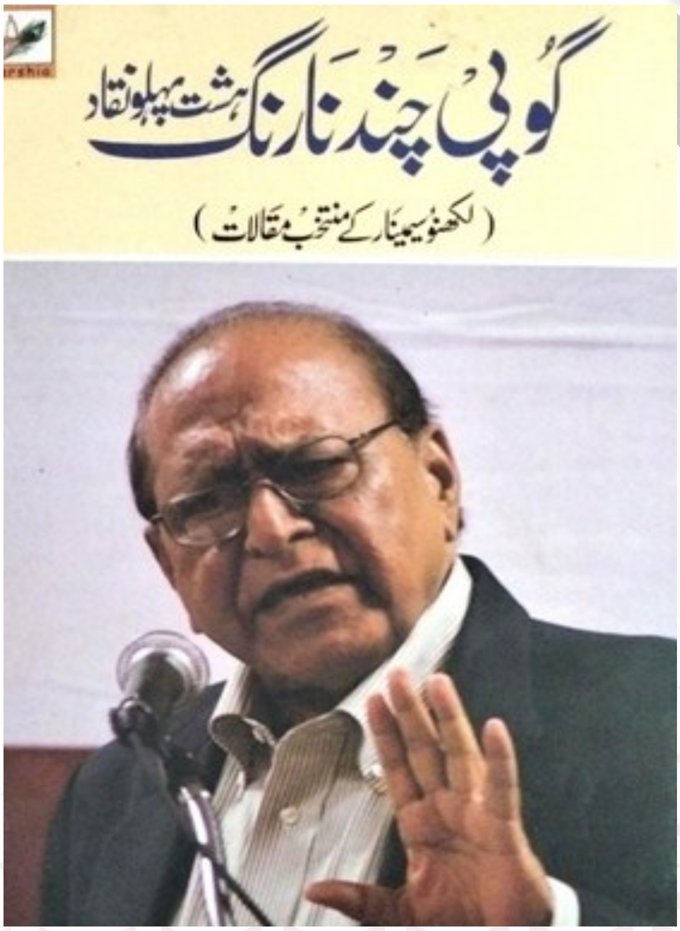

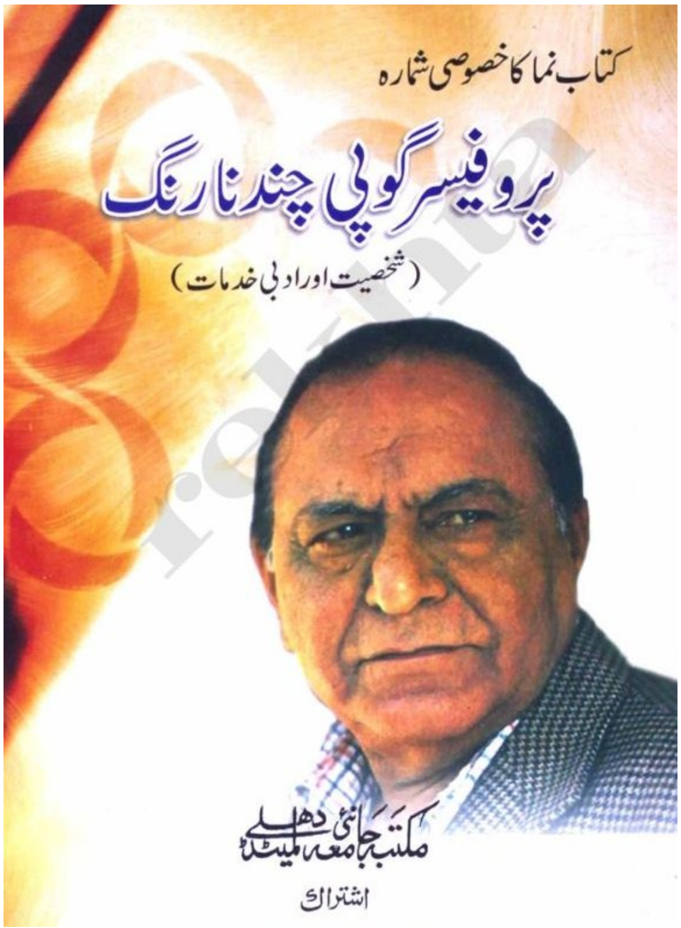

رشتہ بھی اسی سے قائم ہوتا ہے۔ چناں چہ اردو ادب میں ساختیاتی تنقید کو صحیح طور پر روشناس نارنگ جی نے ہی کرایا۔ سچی بات یہ ہے کہ اردو میں اسلوبیاتی تنقید کو اعتبار و وقار بھی انھی کی نگارشات سے حاصل ہوا۔ چوں کہ پروفیسر نارنگ نے لسانیات کی باضابطہ گہری اسٹڈی کی تھی، اس کے تمام شعبوں سے اچھی طرح واقف تھے

اُردو زبان میں گوپی چند نارنگ کا تخلیقی سفر کا آغاز افسانہ نگاری سے ہوا۔ اُن کا پہلا افسانہ کوئٹہ شہر کے ہفتہ وار اخبار ''بلوچستان سماچار'' میں اُس وقت شائع ہوا تھا جب وہ اسکول میں زیر تعلیم تھے۔ رسائل میں لکھنے کی لت لڑکپن میں پڑ چکی تھی۔ جب 1947 میں وہ دہلی آئے تو یہاں پر بھی اُن کے متعدد افسانے 'بیسویں صدی' اور 'ریاست' جیسے رسائل و جرائد میں شائع ہوتے رہے۔ 1953 کے بعد گوپی چند نارنگ نے افسانہ نگاری کی دُنیا کو ترک کر کے تحقیق و تنقید کی دُنیا میں قدم رکھا۔ اُن کا اوّلین مضمون 'اکبر الٰہ آبادی سخن فہموں اور طرفداروں کے درمیان' 'رسالہ نگار' میں جون 1953 میں شائع ہوا اور اُن کا تخلیقی و تنقیدی سفر آج تک جاری و ساری ہے۔ اُن کی پہلی تصنیف 'ہندوستانی قصّوں سے ماخوذ اُردو مثنویاں' ہے جو پہلی بار 1959 اور دوسری بار 1961 میں شائع ہوئی۔ اس کتاب پر نارنگ صاحب کو 1962 میں 'غالب ایوارڈ' سے نوازا گیا۔ اس کے بعد سے اب تک نارنگ صاحب کی تقریباً پانچ درجن سے زیادہ کتابیں منظرِ عام پر آکر ادبی حلقوں میں اپنا جلوہ بکھیر چکی ہیں۔

گٹکے کے خلاف سندھ حکومت کے مؤثر اقدامات

سید عامر حسین

گٹکا، ایسا زہر ہے جسے کھانے والا مزے لیتا ہے اور پھر عمر بھر پچھتاتے ہوئے قبر تک جا پہنچتا ہے۔ صوبہ سندھ میں منشیات فروشی گٹکا اور مین پوری کے استعمال اور فروخت پر صوبائی وزیر اطلاعات شرجیل انعام میمن نے آئی جی سندھ غلام نبی میمن کو سخت نوٹس لینے کا حکم جاری کیا ہے۔

گٹکا کھانے والا اگر شروع میں ہی اسے چھوڑ دے تو بچ سکتا ہے ورنہ بعض اوقات کینسر کے ایسے مریض آتے ہیں جن کا علاج ہمارے لئے ممکن نہیں۔اس گٹکے کی فیکٹریوں کے کتنے ہی مالک کروڑ پتی بن چکے ہیں۔

کافور، گائے کے خون اور تیزاب سے بنائے جانے والے گٹکے میں سڑنے کے بعد کیڑے پڑ جاتے ہیں اور یہی کیڑے انسان کو کھا جاتے ہیں۔ مختلف علاقوں میں گٹکے کو 'ماوہ' یعنی کھویا بھی کہا جاتا ہے، ماوہ میں تمام چیزوں کے ساتھ ساتھ کیوڑا اور چاندی کا ورق بھی ملایا جاتا ہے۔

گٹکا جن چھالیوں سے تیار کیا جاتا ہے اس میں فنگس یعنی پھپھوندی آجاتی ہے جسے عام افراد کی زبان میں کیڑے کہا جاتا

ہے۔ فنگس کی تیزی اور کڑواہٹ کم کرنے کے لیے اس میں مصنوعی کھانے کے رنگوں کی ملاوٹ کردی جاتی ہے۔ بعض اوقات تمباکو کا ذائقہ بھی اس کی کڑواہٹ کو چھپالیتا ہے اور جو لوگ اسے کھانے اور اس کے نشے کے عادی ہو چکے ہوتے ہیں وہ آسانی سے اسے چھوڑ نہیں پاتے۔

گٹکے میں عجیب سا نشہ ہوتا ہے۔ ایک گٹکا کھانے والے نے بتایا کہ 15 سال سے کھا رہا تھا۔ اس سے پہلے پان کھاتا تھا، معلوم نہیں اس میں کیا ڈالتے ہیں جو ذائقے میں پان سے زیادہ اچھا ہوتا ہے۔ اس کو کبھی بنتے ہوئے نہیں دیکھا۔ اگر دیکھ لیتا تو شاید نہ کھاتا۔ گھر والوں نے بہت روکا لیکن چھپ چھپ کر کھاتے تھے۔

اس موذی بیماری کا کوئی حل ہی نظر نہیں آرہا۔ اب تک 4 مرتبہ کیموتھراپی کرا چکا ہوں جس سے سر کے بال جھڑ جاتے ہیں۔ اس دوران مریض نے سر بھی دکھایا سارے بال جھڑ چکے تھے۔ بھائی بھی میرے ساتھ اسپتالوں کے چکر کاٹ کاٹ کر پریشان ہوگئے ہیں۔ بیوی بچے بھی افسردہ رہتے ہیں۔ اس حالت میں کوئی کام بھی نہیں کر سکتا بڑا پریشان ہوں۔ پر کہ گٹکہ کھانے سے نشہ ملتا ہے کیا کھاتے وقت گندگی محسوس نہیں ہوتی؟ مریض نے کہا کہ اگر گندگی محسوس ہوتی یا بدبو ہوتی تو چھوڑ نہیں دیتے؟ اس کو کھانے میں ایک مزا اور نشہ ہوتا ہے جسے کھانے والا چھوڑتا نہیں البتہ اگر اس کو بنتے دیکھ لیتے تو شاید چھوڑ دیتے۔ 15 سال سے کھا رہا ہوں۔ 4 ماہ پہلے منہ میں ایک چھوٹا سا چھالہ ہوا تھا جو بڑھتے بڑھتے کینسر بن گیا۔ میرے بھائی نے مجھے گٹکا کھانے سے بہت روکا لیکن چھپ چھپ کر کھاتا تھا۔ اب علاج کیلئے مختلف اسپتالوں کے چکر کاٹ رہے ہیں لیکن کہیں بھی تسلی بخش علاج نہیں ہو رہا۔ بڑے پریشان ہیں اس وقت کیموتھراپی سے علاج ہو رہا ہے۔

میں اپنے کئے پر بہت پشیمان ہے۔ راتوں کو اٹھ کر روتا ہے اور اس کے علاوہ کر بھی کیا سکتا ہے۔ اللہ ہر شخص کو اس بیماری سے محفوظ رکھے۔ خاندان والے اس کی بیماری کی وجہ سے بہت پریشان ہیں۔ اس کے کھانے پینے کیلئے برتن الگ کر دیئے ہیں تاکہ گھر والوں کو پریشانی نہ ہو لیکن بہت افسوس ہوتا ہے جب یہ الگ کھاتا ہے۔ مریض نے مجھ سے بات کرتے ہوئے التجا کی کہ جو لوگ اپنے بچوں اور گھر والوں سے محبت کرتے ہیں وہ کبھی بھی ان چیزوں کے قریب نہ جائیں ورنہ وہ بھی میری طرح اس اذیت میں مبتلا ہو سکتے

Sharjeel Inam Memon
@sharjeelinam

Hyderabad Police and Administration has started grand operation against Mainpuri, Gutka and drugs. In last 36 hours this is the good achievement by them. Inshallah this operation will continue in every district of province under the supervision of our CM Sindh.

S. #	Police Stations	Total Cases	Total Arrested	RECOVERY						
				Chars	Ice	Manpuri	Gutka	Sacks	Pints/ Nibs	Bottles/ Liters
1	CITY	2	2			130	643		4	
2	FORT	6	6			815	5000	22	14	
3	MARKET	1	2				5500			
4	SAKHI PIR	3	3			300			4	
5	CANTT	3	3	2065						
6	GOR	1	1			100				
7	PHULLELI	6	7	1435		1060	418			
8	PINYARI	8	14	1210		640	5500	29		35
9	A.SECTION	9	11	1060		1050	7000	160	30	
10	AIRPORT	3	2			400			7	
11	H-ABAD	5	7	450		200	22000	352		50
12	B.SECTION	2	3						4	15
13	Q.ABAD	7	10			640			59	
14	N.NAGAR	5	5	510		1320				
15	BALDIA	4	4	670		1187	5500			
16	B.NAGAR	1	1		750					
17	HALI RAOD	11	14	2370		1600		42		20
18	M.SHAH	1	1			180				
19	SITE	5	4	1435		2200		65		
20	T-YOUSUF	6	6			290	660	15		20
21	TANDO JAM	7	9	1050		900	1170	29		40
22	RAHOKI	1	1							15
23	HUSRI	7	10			3200	8400	189		
24	PABBAN	6	10			310			5	55
25	HATRI	7	8			800	5332	43		45
26	CHALGARI	2				400				
	TOTAL	119	144	12255	750	17722	67123	946	127	295

ہیں۔ بڑی بیٹی 15 سال اور بیٹا 11 سال کا ہے۔ گھر والوں کا رو رو کر برا حال ہے۔ کیموتھراپی کرانے کے بعد ایسی حالت ہو جاتی ہے کہ بستر سے اٹھ نہیں سکتا۔ پورے جسم میں درد ہوتا ہے۔ کھانے پینے کو دل نہیں چاہتا۔ زبان میں کسی کھانے کا ذائقہ نہیں آتا۔ ایسا لگتا ہے مٹی کھا رہا ہوں۔ جسم میں پانی کی کمی سے گردوں میں تکلیف ہو جاتی ہے۔ خون کم ہو جاتا ہے۔ کھانا جو آرام سے کھا سکتے ہیں ان ہیں زیادہ تر نرم اور ہلکی غذائیں شامل ہیں۔ مرچی اور مرغن کھانوں سے جلن اور تکلیف ہوتی ہے۔ کھانے میں جو سہولتیں پہلے تھی وہ اب نہیں ہیں۔

رنگ برنگے کاغذوں میں جگہ جگہ بکنے والے گٹکے کی تیاری میں ہر وہ مضر صحت چیز استعمال کی جاتی ہے جو کینسر کے علاوہ مسوڑھوں، حلق، پھیپھڑوں، معدے کی جان لیوا بیماریوں کا سبب بنتی ہے۔ گٹکے اور مین پوری کے شائقین یہ جاننے کے باوجود کہ گٹکا اور مین پوری کینسر جیسی مہلک بیماری کا سبب بن سکتا ہے، اپنی لت سے دستبردار ہونے کو تیار نہیں ہوتے۔ گٹکے کی تیاری میں بنیادی طور پر خشک چھالیہ، تمباکو، کتھا اور چونے کا استعمال کیا جاتا ہے۔ گٹکے میں جو سپاری استعمال ہوتی ہے وہ سی گریڈ یعنی سب سے ناقص قسم کی ہوتی ہے۔ بعض جگہوں پر یہ گٹکا 'تر' ہوتا ہے یعنی اسے خشکی سے بچانے کے لیے اس میں بار بار کتھے کا پانی، زعفران اور غیر ملکی تمباکو کو ملایا جاتا ہے۔

لوگوں کو ماوا کھانے کی عادت ہو گئی ہے، ماوے میں ناقص چھالیہ استعمال ہوتی ہے، کچھ لوگ چونے کے پانی یا مبینہ طور پر بیٹری کا پانی استعمال کرتے ہیں، جس سے چھالیہ گل جاتی ہے لیکن زیادہ تر لوگ چونے کے پانی یا سادہ پانی میں چھالیہ گلاتے ہیں، پھر اس چھالیہ کو خشک کر کے اس میں مختلف اقسام کا تمباکو ڈالا جاتا ہے، پھر اس میں چونے کا پانی یا حسب ذائقہ کتھ ملایا جاتا ہے، جس کے بعد ماوا تیار ہو جاتا ہے۔

طبّی ماہرین کے مطابق ماوا گٹکا چھالیہ اور تمباکو کا استعمال مضر صحت ہے، جو منہ کے کینسر کا باعث بن رہا ہے، کراچی میں منہ کے کینسر میں خطرناک حد تک اضافہ ہو رہا ہے، کینسر کا علاج بہت مہنگا ہے، لوگوں کو چاہیے کہ وہ ان اشیا کا استعمال ترک کر دیں اور اپنی صحت کا خیال کریں۔

حکومت سندھ کے موثر اقدامات کے باعث ماوا یا گٹکا کی فروخت پر مکمل پابندی عائد ہے، لوگوں کو اس عادت کو خود بھی ترک کرنا ہوگا، لوگوں کو چاہیے کہ وہ اپنی صحت کا خود خیال کریں، ماوا اور گٹکا تیار کرنے والوں کے خلاف مزید سخت ایکشن لیا جائے گا۔■

آسٹیوپوروسس

محمد سلمان

آسٹیوپوروسس کو ایک نظاماتی خرابی کے طور پر بیان کیا جاتا ہے۔یہ ہڈیوں کی مضبوطی ہڈیوں کی کثافت اور ہڈیوں کے معیار کے انضمام سے ظاہر ہوتا ہے۔

ہڈیوں کا بھربھرا پن ایک عام مرض ہے، جسے طبّی زبان میں آسٹیوپوروسس کہا جاتا ہے۔آسٹیوپوروسس کے مرض میں بعض اوقات تو ہلکا سا دباؤ پڑنے، مڑنے، کوئی وزنی چیز اُٹھانے حتیٰ کہ کھانسنے یا چھینکنے سے بھی ہڈی میں فریکچر ہوجاتا ہے۔ماہرینِ صحت کے مطابق یہ دنیا میں دل کے امراض کے بعد دوسرا بڑا مسئلہ ہے۔

پاکستان میں متوقع عمر 1960 میں 46.6 سال سے بڑھ کر 2010 میں 65.4 سال ہوگئی ہے اور 2023 میں 72.4 سال تک پہنچنے کا امکان ہے۔بوڑھوں کی آبادی میں مسلسل اضافے اور ناقص غذائیت کے ساتھ آسٹیوپوروسس صحت عامہ کے ایک بڑے مسئلے کا درجہ حاصل کررہا ہے۔

ماہرین اسے ایک 'خاموش بیماری' کا نام بھی دیتے ہیں کیونکہ اس میں ہڈیوں کی فرسودگی کا عمل کسی تکلیف کے محسوس ہوئے بغیر سُست روی سے جاری رہتا ہے، ممکن ہے آسٹیوپوروسس ہونے کے بعد مریض درد یا تکلیف محسوس کرنے لگے۔اگر وہ کسی وجہ سے گر

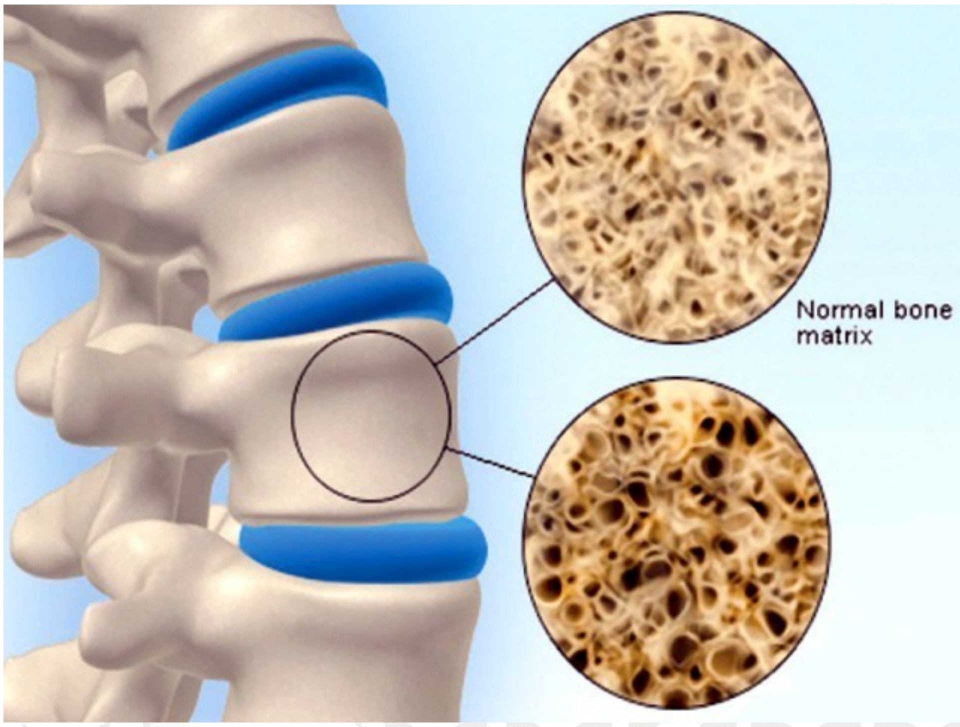

جائے تو گرنے اور اُٹھنے کے دوران ان کے ہاتھوں یا پیر کی ہڈی میں فریکچر ہو جاتا ہے۔ اس بیماری کی علامات عموماً دیر سے ظاہر ہوتی ہیں۔ اس کی ابتدائی علامات میں مریض کو جوڑوں کے درد کے ساتھ ساتھ اُٹھنے بیٹھنے میں بھی تکلیف محسوس ہوتی ہے۔

بعض فربہ افراد کی ہڈیوں کے اندر چربی چھپی ہوئی ہوتی ہے، جس کے باعث وہ کمزور پڑ جاتی ہیں اور آسانی سے ٹوٹ سکتی ہیں۔ فربہ افراد کے جسم کے مختلف اعضا میں چربی چھپی ہوئی ہوتی ہے، جن میں جگر، پٹھے، ہڈیوں کا گودا شامل ہیں۔ سیب کی شکل کا جسم رکھنے والے اشخاص سب سے زیادہ خطرے کی زد پر ہوتے ہیں۔ یہ وہ افراد ہیں جن کی زیادہ وزن کمر کے آس پاس مرکوز ہوتا ہے۔

دنیا بھر میں ہر تین میں سے ایک عورت اور 50 سال یا اس سے زیادہ عمر کے پانچ میں سے ایک مرد آسٹیوپوروٹک فریکچر کا شکار ہیں

آسٹیوپوروسس کی وجہ سے ہڈیاں کمزور اور نازک ہو جاتی ہیں اور معمولی چوٹ، ٹکرانے، چھینک یا اچانک حرکت کے نتیجے میں آسانی سے ٹوٹ جاتی ہیں۔ آسٹیوپوروسس کی وجہ سے ہونے والا فریکچر جان لیوا، تکلیف دہ اور طویل مدتی معذوری کی ایک بڑی وجہ ہے۔

آسٹیوپوروسس کی وجہ سے ہونے والے فریکچر کا دنیا بھر میں لاکھوں لوگوں پر تباہ کن اثر پڑتا ہے اس کے باوجود کہ فریکچر کو کم کرنے کے لیے موثر طبّی پیش رفت کی جا چکی ہے۔ مردوں اور عورتوں کی ایک قلیل تعداد ہی علاج کرواتی ہے۔

اس بیماری کی علامات عموماً دیر سے ظاہر ہوتی ہیں۔ اس کی ابتدائی علامات میں مریض کو جوڑوں کے درد کے ساتھ ساتھ اٹھنے بیٹھنے میں بھی تکلیف محسوس ہوتی ہے۔

کچھ خطرے والے عوامل جو آپ کو آسٹیوپوروسس کے لیے

زیادہ حساس بناتے ہیں:

جنس: عورتوں کو مردوں کے مقابلے زیادہ کثرت سے آسٹیوپوروسس ہوتا ہے۔

عمر: آپ کی عمر جتنی زیادہ ہوگی، آپ کے آسٹیوپوروسس کا خطرہ اتنا ہی زیادہ ہوگا۔

جسمانی سائز: چھوٹی، پتلی خواتین کو زیادہ خطرہ ہوتا ہے۔

خاندانی تاریخ: اگر یہ خاندان میں چلتی ہے تو آپ کو اس کے ملنے کا زیادہ امکان ہوتا ہے۔

جنسی ہارمونز: حیض کے دورانیے میں کمی یا رجونورتی کی وجہ سے ایسٹروجن کی کم سطح خواتین میں آسٹیوپوروسس کا سبب بن سکتی ہے۔ کم ٹیسٹوسٹیرون کی سطح مردوں میں آسٹیوپوروسس لا سکتی ہے۔

Anorexia nervosa: یہ کھانے کی خرابی اس کا باعث بن سکتی ہے۔

کیلشیم اور وٹامن ڈی کی مقدار: کیلشیم اور وٹامن ڈی کی کم خوراک آپ کو ہڈیوں کے گرنے کا زیادہ خطرہ بناتی ہے۔

دواؤں کا استعمال: کچھ دوائیں خطرے میں اضافہ کرتی ہیں۔

سرگرمی کی سطح: ورزش کی کمی یا طویل مدتی بستر آرام کی وجہ سے ہڈیاں کمزور ہو سکتی ہیں۔

سگریٹ نوشی: سگریٹ ہڈیوں، دل اور پھیپھڑوں کے لیے بھی نقصان دہ ہے۔

آسٹیوپوروسس سے بچنے کے لیے غذا کے ذریعے مردوں خصوصاً خواتین کو یومیہ 1300 ملی گرام کیلشیم حاصل کرنا چاہیے۔

ماہرین کے مطابق ہڈیوں کی کمزوری اور بھربھرے پن کا مسئلہ مردوں کے مقابلے میں عورتوں میں 40 فی صد زیادہ ہوتا ہے۔ 45 سال کی عمر کے بعد عورتوں میں اس بیماری کا خطرہ بڑھ جاتا ہے۔ یہ بیماری

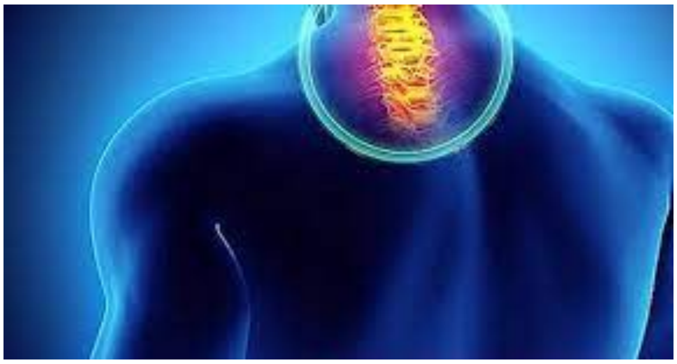

یوں تو پورے جسم کی ہڈیوں کو متاثر کرتی ہے، لیکن ریڑھ، کولہے اور کلائی پر اس کا زیادہ اثر پڑتا ہے۔ ہڈیوں کی مضبوطی کا تعلق سورج کی روشنی یا دھوپ سے بھی ہے۔

اس کے علاوہ خوراک میں دودھ، مچھلی اور ہڈیوں کو مضبوط بنانے والی دیگر اجناس کا استعمال نہ کرنا بھی اس شکایت کا سبب بنتا ہے۔ اس کے مقابلے میں دیہی علاقوں میں مرد اور خواتین کا زیادہ وقت کھلی جگہ پر گزرتا ہے۔ وہ کھیتوں میں کام کرتے ہیں۔ ان کی غذا میں دودھ کا استعمال زیادہ ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں کا خطرہ کم ہوتا ہے۔

اگر مریض ادویات سے بچنا چاہتا ہے تو صرف بیس منٹ روزانہ سن باتھ لے جس سے جسم کی روزانہ کی وٹامن ڈی3 کی ضرورت پوری ہو جاتی ہے۔ یہ وٹامن ہڈیوں میں کیلشیم کو جمع کرنے کے لیے نہایت ضروری ہے۔ یہ وٹامن جلد میں موجود ہوتا ہے اور سورج کی روشنی جسم پر پڑنے سے متحرک ہو جاتا ہے اور ہڈیوں تک کیلشیم کو پہنچانا شروع کر دیتا ہے

اس کے برعکس، فاسفورس، پروٹین اور نمک کا یومیہ ضرورت سے زیادہ استعمال آسٹیوپوروسس کا باعث بنتا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ زیادہ پروٹین اور فاسفورس پر مشتمل غذائیں پیشاب کے ذریعے کیلشیم کے اخراج میں اضافے کا سبب سمجھی جاتی ہیں۔ ریفائنڈ شوگر بھی جسم میں کیلشیم کی کمی بڑھاتی ہے۔

نفسیات کے نظریات تصورات

اطہر بیگ

نفسیات جس انگریزی لفظ Psychology ک اترجمہ ہے، یہ دو یونانی الفاظ Psychyاور Logosکا مرکب ہے۔ یونانی دیومالا میں سائیکی روح کی دیوی ہے۔ جب کہ Logosکا مطلب لفظ، کلمہ اور بول ہے تو گویا سائیکالوجی کے لغوی معنی ہی میں اس کا مفہوم بھی شامل ہے۔ یعنی انسان کی روح کے بارے میں علم۔

نفسیات کے نظریات:

انیسویں صدی عیسوی کے آغاز کے ساتھ ہی نفسیات کے بہت سے موضوعات پر وسیع پیمانے پر تحقیقات شروع ہو گئی تھیں۔ شخصیت کے بارے میں زیادہ تر نظریات مختلف ماہرین نفسیات نے نفسیاتی امراض کی تشخیص اور علاج کے دوران حاصل ہونے والی معلومات کی روشنی میں مرتب کیے۔ ان میں سے ایک تحلیل نفسی یا سائیکوانالیسز ہے۔اس نظریے کی بنیاد آسٹریلیا سے تعلق رکھنے والے مشہور ماہر نفسیات سگمنڈ فرائڈ نے رکھی، وہ بنیادی طور پر ایک ڈاکٹر تھا، لیکن بعد ازاں نفسیات، خصوصاً غیر نارمل نفسیات اس کی دلچسپی کا مرکز بن گئی۔ نفسیاتی امراض کی تشخیص اور علاج کی تربیت کے لیے وہ فرانس گیا اور ہپناٹزم کی تربیت حاصل کی۔ لیکن فرائڈ نے جلد ہی محسوس کیا کہ یہ طریقہ علاج زیادہ کار گر نہیں۔ وہ اپنے کلینک میں نفسیاتی امراض کا مشاہدہ کرتا رہا اور اپنے مشاہدات کو قلم بند کرتا گیا، اس نے اپنے مشاہدات اور تجربات کی بنیاد پر ایک طریقہ علاج مرتب کیا جس کا نام تحلیل نفسی رکھا۔ تحلیل نفسی صرف نفسیاتی

علاج ہی کا طریقہ نہیں بلکہ تحقیق کا بھی ایک موثر ذریعہ ثابت ہوا جس کے نتیجے میں تحلیل نفسی کے کئی روپ سامنے آئے۔ ۱) یہ ایک طریقہ علاج ہے، ۲) زندگی کے بارے میں ایک فلسفیانہ نکتہ نظر ہے، ۳) شخصیت کا ایک نظریہ ہے۔ فرائڈ کا خیال ہے کہ انسانی شخصیت کا تعین اور تشکیل دو اعمال سے ہوتی ہے۔ پہلے عمل کے تحت فرائڈ تمام نفسیاتی وظائف کو تین نظاموں میں تقسیم کرتا ہے۔ انہیں وہ لاذات (Id)، انا (Ego) اور فوق الانا (Super ego) کا نام دیتا ہے اور انہیں شخصیت کے تین اجزا قرار دیتا ہے۔ بعض اوقات یہ تینوں نظام آپس میں تعاون کرتے ہیں، لیکن اکثر ان میں تصادم رہتا ہے۔ اسی تصادم اور تعاون کے نتیجے میں فرد میں شخصی اوصاف پیدا ہوتے ہیں۔ دوسرا عمل نفسی جنسی نشوونما ہے، بچہ پیدا ہونے کے بعد مختلف نفسی جنسی مراحل سے گزرتا ہے جو اس کی آئندہ شخصیت کا تعین کرتے ہیں۔ فرائڈ کے نظریہ شخصیت کے چند بنیادی تصورات یہ ہیں۔ نفسی جبریت (Psychic Determination): نفسی جبریت کا مطلب ہے کہ ہر قسم کا کردار اندرونی نفسی اسباب کی وجہ سے تشکیل پاتا ہے، اگرچہ بعض اوقات ان اسباب کی فوری طور پر نشاندہی نہیں کی جا سکتی۔ اس نظریے کے مطابق ہماری معمولی سے معمولی بات بھی بلا مقصد نہیں ہوتی۔ مثلاً کسی کے ساتھ مقرر کر کے بھی ملاقات کے لیے نہ جانا محض فراموشی نہیں، یہ اس فرد کی اندرونی خواہش کی وجہ سے بھی ہو سکتا ہے۔ یعنی ممکن ہے وہ فرد متعلقہ شخص سے ملنا ہی نہ چاہتا ہو۔ نظریہ ذہن: فرائڈ کا خیال ہے کہ انسانی ذہن تین حصوں (1) شعور (Conscious)، (2) تحت الشعور (Sub-Conscious)، (3) لاشعور (Unconsious) پر مشتمل ہے۔ اس وقت آپ جن باتوں سے آگاہ ہیں انہیں شعور کہا جاتا ہے جبکہ تحت الشعور ایسے خیالات پر مشتمل ہے جس سے آپ اس وقت آگاہ نہیں لیکن تھوڑی سی کوشش کرنے سے انہیں شعور میں لایا جا سکتا ہے۔ لاشعور ان باتوں اور واقعات پر مشتمل ہے جو فرد کو بالکل یاد نہیں ہوتے۔ ایک خاص نفسیاتی عمل کے ذریعے اخلاقی طور پر ناقابل قبول خواہشات کو شعور سے خارج کر دیا جاتا ہے تب یہ خواہشات لاشعور میں چلی جاتی ہیں اور مختلف طریقوں سے فرد کے کردار پر اثرانداز ہو سکتی ہیں۔ جارحانہ و دیگر محرکات: فرائڈ کا خیال ہے کہ فرد میں پیدائشی طور پر جنس اور جارحیت پر مبنی محرکات پائے جاتے ہیں۔ فرد ان کی تسکین معاشرتی اقدار اور اخلاقی اصولوں کے اندر رہ کر ہی کر سکتا ہے بصورت دیگر اسے پسندیدہ شخص قرار نہیں دیا جاتا۔

تحلیل نفسی:

تحلیل نفسی psycho-analysis کا بانی سگمنڈ فرائیڈ اس دور میں آسٹرین سلطنت کے ایک ملک اور موجودہ چیکو سلواکیہ کے ایک قصبے فرائی برگ میں 1856 میں پیدا ہوا۔ جب وہ چار برس کا تھا، اس کا خاندان ویانا منتقل ہو گیا جہاں وہ قریب تمام عمر رہا۔ سکول میں فرائیڈ ایک غیر معمولی ذہین طالب علم تھا۔ اس نے طب میں اپنی ڈگری 1881 میں ویانا یونیورسٹی سے حاصل کی۔ اگلے دس برسوں میں اس نے علمِ عضویات میں تحقیق کی۔ ایک نفسیاتی علاج گاہ کے عملے میں شامل رہا، علم الاعصاب میں پیشہ وارانہ ریاضت کی۔ فرانسیسی ممتاز ماہر علم الاعصاب ژاں چار کوت کے ساتھ پیرس میں کام کیا اور ویانا کے معالج جوزف برائر کے ساتھ بھی کام کیا۔

فرائیڈ کے تصورات:

نفسیات پر فرائیڈ کے تصورات بتدریج پروان چڑھے۔ 1895 میں کہیں اس کی پہلی کتاب ”ہسٹریا“ پر تحقیقی مقالہ چھپا، جس کا دوسرا مصنف برائر تھا۔ اس کی اگلی کتاب ”خوابوں کی توضیح“ 1900 میں شائع ہوئی۔ یہ اس کی شاندار اور انتہائی یادگار تحریروں میں شمار ہوتی ہے۔ اگرچہ پہلے پہل کتاب کی فروخت سست رفتاری سے ہوئی۔ تاہم

اس سے اسے خاصی شہرت حاصل ہوئی۔ پھر دوسری کتابیں منظرِ عام پر آئیں۔ 1908 میں جب فرائیڈ امریکہ لیکچر دینے آیا تو وہ پہلے ہی خاص وعام میں سندِ مقبولیت حاصل کر چکا تھا۔ 1902 میں اس نے ویانا میں نفسیاتی موضوعات پر مذاکر کرنے کے لئے ایک تنظیم بنائی۔ ابتدائی اراکین میں الفرڈ ایڈلر بھی شامل تھا۔ چند سال بعد اس میں کارل یونگ آ گیا۔ دونوں احباب نے نفسیات کی دنیا میں بے پناہ شہرت حاصل کی۔

فرائیڈ کے علمی کارنامے:

علمِ نفسیات میں فرائیڈ کے کارنامے اس قدر بے پایاں ہیں کہ انہیں مختصراً بھی یہاں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ اس نے انسانی رویے میں لا شعوری ذہنی عوامل کی اہمیت پر سب سے زیادہ زور دیا۔ اس نے ثابت کیا کہ کس طرح یہ عوامل خوابوں کو متاثر کرتے ہیں اور کس طرح عمومی نوعیت کی کمزوریاں پیدا کرتے ہیں جیسے زبان کی ہکلاہٹ اور ناموں کی فراموشی یا پھر خود ساختہ سانحات یا حتیٰ کہ بیماریاں بھی

ذہنی عارضے کا علاج:

فرائیڈ نے ذہنی عارضے کے لیے تحلیل نفسی کا طریقہ کار اختراع کیا۔ اس نے انسانی شخصیت کا ایک ڈھانچہ وضع کیا۔ اس اضطران، دفاعی میکانیت، آختہ الجھن (castration complex) دباؤ، ارتفاع (sublimation) جیسی متعدد مختلف صورت احوال کے متعلق نفسیاتی نظریے وضع کیے اور انہیں عام کیا۔ اس کی تحریروں نے عوام کی نفسیات میں دلچسپی کو کئی چند کیا۔ اس کے متعدد نظریات متنازعہ فیہ ہیں اور جب سے وہ منظرِ عام پر آئے ہیں ان پر گرما گرم مباحث ہو رہے ہیں۔ فرائیڈ کی ایک شہرت یہ نظریہ پیش کرنے کے باعث ہے کہ دبی ہوئی جنسی خواہشات عموماً ذہنی بیماری یا neurosis کے ظہور میں بنیادی کردار ادا کرتی ہیں۔ در حقیقت فرائیڈ اس خیال کا مخترع نہیں تھا، ہاں اس کی تحریروں نے اس خیال کو سائنسی درجہ عطا کیا۔ اس نے یہ موقف ظاہر کیا کہ جنسی ہیجانات اور خواہشات کا آغاز بچپن میں ہی ہوتا ہے نہ کہ بلوغت میں۔ چونکہ فرائیڈ کے متعدد نظریات ہنوز متنازعہ فیہ ہیں۔ تاریخ میں اس کی اصل حیثیت کا تعین کرنا دشوار ہے۔ فرائیڈ میں جدت پسندی کا مادہ غیر معمولی تھا۔ ڈارون یا پاسچر کے برعکس فرائیڈ کے نظریات سائنسی علماء کے طبقہ سے عمومی طور پر پذیرائی حاصل نہیں کر سکے۔

انسانی فکر کی تاریخ میں فرائیڈ ایک ممتاز ترین شخصیت کے طور پر موجود ہے۔ نفسیات پر اس کے تصورات نے انسانی ذہن کے تصور میں انقلابی تبدیلی پیدا کی ہے۔ وہ متعدد نظریات اور اصطلاحات جو اس نے متعارف کروائیں زبان کے عام استعمال کا حصہ بن گئیں۔ جیسے id, ego, oedipus complex اور جبلتِ مرگ وغیرہ۔

سچ اور جھوٹ کا رزم نامہ

افسانہ بدر

محمد حسین آزاد ایک صاحبِ طرز انشاء پرداز، زبان دان، نقاد اور شاعر ہیں۔ اردو کے عناصر خمسہ میں اپنی رنگین بیانی کے لحاظ سے آپ کو ایک منفرد حیثیت حاصل ہے۔ آپ کی تحریروں میں فکر کے موتی، علم کے چراغ، ظرافت کے پھول، فن کی روشنی اور تحقیق کی چاندی سب ہی کچھ شامل ہے۔ محمد حسین آزاد کے منفرد اندازِ بیان کی بناء پر صاحبِ علم طبقے نے آپ کو "آقائے سخن" کے لقب سے نوازا ہے۔ بقول مولانا صلاح الدین:

الفاظ کے جو نگینے اس نادر کار نے اپنی عبارت کے کندن میں جڑے ہیں اور تشبیہات کے جن گہر ہائے آبدار سے اُس نے اپنی نگارش کی تزئین کی ہے، اُن کی درخشانی اور جمال آج بھی آنکھوں کو خیرہ کر دیتی ہے۔

دنیا جب سے معرضِ وجود میں آئی ہے اُس میں سچ اور جھوٹ اور حق و باطل کی جنگ جاری ہے۔ انسان کو انسان بنانے کے لئے خیر کی قوتیں ہزاروں برس سے لگی ہوئی ہیں اور شر کی کھلی طاقتیں اُس کو حیوان بنانے میں سر گرم عمل ہیں۔ جھوٹ ہزاروں بھیس بدل کر سچائی کے راستے کی رکاوٹ بنتا ہے مگر سچائی اُسے قدموں تلے روند کر اپنی منزل کی طرف گامزن ہو جاتی ہے۔ اِس لافانی حقیقت کو مولانا آزاد نے تمثیلی انداز میں سچ اور جھوٹ کا رزم نامہ کے عنوان سے پیش کیا ہے۔

بقول شاعر:

ہزار بادِ مخالف کا زور ہو لیکن
سفینے شدت طوفان کو مات دے دیں گے

"نیرنگ خیال" کے مضامین نو آبادیاتی نظامِ حکومت کے شکنجے سے نجات کے لیے حقیقت میں وہ تدبیر نامہ سمجھا جا سکتا ہے کہ جس سے ہندوستانی مسلمان تعلیم اور محنت کے بل بوتے پر اپنی دنیا آپ پیدا کر سکتے تھے۔ ایسے اخلاقی و تربیتی مضامین لکھنے کا رجحان اس لیے بھی پرورش پا گیا کیونکہ یہ سرزمینِ ہندوستان میں مسلمان قوم کے سیاسی، معاشی و معاشرتی استحصال کا دور تھا۔ اس سیاسی، سماجی و معاشی استحصال میں ہندوستانی مسلمانوں کا اپنا منفی کردار بھی شامل تھا۔ صورتحال کچھ یُوں بھی مخدوش تھی کہ جن کے حالات و وسائل قدرے بہتر تھے وہ بھی سائنس، آرٹ، معیشت و سیاست میں اپنی نفسی توانائیاں اور طبعی وسائل صرف کرنے کو تیار نہ تھے بلکہ اکثریت تو ایسے علم کے حصول کو بدعت اور انگریز کی مزید غلامی متصوّر کیے ہوئے تھی۔ سر سیّد جیسے دور اندیش مصلح نے اسے اپنی دور بین نگاہ سے جان لیا تھا کہ نو آبادیاتی نظام کے طاقتور ریلے کا مقابلہ جواباً طاقت کا زور نہیں بلکہ ذہانت و فطانت کے حربے میں پنہاں ہے۔

انھوں نے صداقت کی سچائی اور صداقت کے خاندان سے آگاہ کرتے ہوئے اس کی خوبیوں کو بیان کیا ہے۔ مولانا آزاد کہتے ہیں کہ صداقت یا سچائی نے ملکہ دانش یعنی فہم و فراست کی گود سے جنم لیا اور وہ سلطانِ آسمانی کی شفقت میں پروان چڑھی جسکو بلحاظِ تعلیم و تربیت قدرت نے شاہکار اور بے مثل بنایا تھا۔ جوان ہونے پر اپنے باپ جو آسمان کے روپ میں ساری دنیا کا احاطہ کیے ہوئے ہے کہ روبرو حاضر ہوئی تاکہ دنیا میں اپنے کردار کی ادائیگی کے لئے اجازت حاصل کر سکے۔

مولانا کہتے ہیں کہ سلطانِ آسمانی نے صداقت زمانی کو نیکی، بھلائی اور دیگر پسندیدہ اوصاف کا مالک پایا۔ اہلِ دربار نے بھی اس کی خوبیوں کا اعتراف کرتے ہوئے اس کی تعریف کی باپ نے اسکے سر پر ہمیشہ قائم رہنے والے وقار کا سجا ہوا تاج رکھا۔ اسے دعائیں دیں کہ وہ اپنے مشن میں کامیاب ہو، اس کی حکمرانی ہمیشہ ہمیشہ قائم و دائم رہے اور حکم دیا کہ دنیا میں جا کر لوگوں میں اپنی روشنی پھیلاؤ، ان کی رہنمائی کرو تاکہ اولادِ آدم (انسان) تاکہ انسان کے شر سے محفوظ رہ سکے کیونکہ یہ شیطانی قوتیں مختلف روپ دھار کر گمراہ کرتی رہتی ہیں۔ تمھارے وجود سے ان میں حق و باطل کی تمیز پیدا ہو گی اور وہ تمھارے طفیل بدی کی قوتوں کو شکست دے کر اپنے مقصدِ تخلیق سے نہ بھٹک سکیں۔

مولانا لکھتے ہیں کہ دنیا میں صداقت زمانی جیسی عظیم قوت جو نیکی اور سچائی کی ضمانت ہے اسکے مدِ مقابل دوسری دیو ہیکل شیطانی قوت دروغ یا جھوٹ تھا جس کا باپ تاریک الدماغ، منفی سوچ کا حامل، بے ہودہ اور قابل نفرت اوصاف کا حامل احمق تھا اور ماں نفسانی خواہشات کی پجاری ہوس تھی۔

ویسے تو اس شیطان صفت دروغ کو ناپسندیدہ اور نامعقول سمجھتے ہوئے سلطانی آسمانی نے اپنی مجلس میں آنے کی اجازت نہ دی مگر پھر بھی وہ موقع ملتے تفریح یا ہنسی مذاق کی محفلوں میں یا جشن کی محفلوں میں مراثیوں کے حلئے میں چھپ کر آ جاتا جو سوانگ بھر کر اور روپ بدل بدل کر اہلِ مجلس کے دلوں کو لبھانے اور جھوٹی مسرتوں سے ان کے قلوب کو بہلانے کی خاطر آیا کرتے تھے۔ ان کے توسط سے دربار میں پہنچ کر وہ اپنی کرشمہ سازیوں اور فتنہ سازیوں کے جادو جگایا کرتا تھا۔

یہ شیطانی فرزند دروغ، سلطانی آسمانی اور اس کی لاڈلی بیٹی صداقت زمانی سے حد درجہ نفرت اور دل میں نفاق رکھتا تھا۔ جب اس نے دربار میں صداقت زمانی کا یہ وقار دیکھا اور اس کے باپ سلطانِ آسمانی کا اسکو دنیا میں بھیجنے کا سندیسہ سنا تو پیچ و تاب کھاتا ہوا دربار سے کھسک کر اسکے خلاف بر سرِ پیکار ہونے کی خاطر دنیا میں پہنچا تاکہ انسانوں کے دلوں پر اپنی حکمرانی قائم کر سکے۔

آزاد کہتے ہیں کہ جیسی ہی سچ اور جھوٹ کی قوتوں نے دنیا میں اپنا اپنا ڈیرہ جمایا اور ایک دوسرے کے صف آراء ہو گئے تو ان میں سے ہر ایک کی یہ کوشش تھی کہ انسانوں پر اپنی بالادستی قائم کرے اور دوسرے کے اثرات کو مرتب نہ ہونے دے۔ چنانچہ دونوں اپنے اپنے مشن کی کامیابی کے لئے پوری توانائیوں کے ساتھ مستحرک ہو گئے۔ جھوٹ کی پوری کوشش ہوتی کہ اولاد آدم اس کے جال میں گرفتار ہو کر بدی کی عاشق ہو جائے اور نیکی ترک کر دے۔ جب کہ سچائی کی بھرپور کوشش تھی کہ انسان دروغ کے جال میں پھنس کر راہِ حق اور بھلائی کے راستے سے نہ بھٹکیں۔ وہ انسانوں کو دروغ کے فریب اور شیطانی صفات سے آگاہ کرتی رہتی غرض کہ دونوں اسی تگ و دو میں مصروف رہتے اور مقابلہ جاری رہتا۔

آسمانی مخلوق فرشتے دنیا پر نگاہیں جمائے ان دونوں کی معرکہ آرائی دیکھتے رہتے اور اس کے نتائج جاننے کے لئے مسلسل اسی طرف متوجہ رہتے تاکہ انھیں معلوم کہ کون دروغ کا پرستار، جھوٹ کا دلدادہ ہے اور کون

سچ کا مطیع، نیکی کا امین اور حق و صداقت کا طرفدار ہے غرض وہ اس معرکہ آرائی میں فاتح اور شکست خوردہ کردار سے آگاہ ہونا چاہتے تھے۔

آزاد سچ اور جھوٹ کے باہمی مقابلے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ قوی، دیوہیکل اور شیطانی صفات کا حامل دروغ ایک بہروپیا تھا۔ وہ روپ بدل بدل کر وار کرنے میں مہارت رکھتا تھا۔ کبھی وہ سچ کا فرضی روپ دھار کر انسانوں کو بہکاتا کہ وہ ہی اصل نیکی ہے لیکن جب وہ اپنے اس فریب کا جال بچھاتا تو جھوٹ کے پیر نہیں ہوتے کے مصداق ہر لمحے اس پر بوکھلاہٹ اور گھبراہٹ طاری رہتی۔ دوسروں کو فریب دینے میں بے شمار قوتیں اسکی مددگار اور معاون ہوتیں، اس موقع پر وہ ہوس، لالچ، بے غیرتی، بے حیائی، دغا اور طراری جیسی قوتوں کو حملہ آور ہونے کا حکم دیتا۔ یہ قوتیں انسانوں کے دلوں میں دروغ کی اہمیت اور صداقت کی کمتری کا احساس کر کے باور کراتیں میں کہ فتح و سربلندی جھوٹ کے سر ہے جو جتنا جھوٹ بول سکتا ہے وہ اتنا ہی کامیاب ہے۔دغا و فریب جو دروغ کے چہیتے تھے، انسانوں کو دروغ کے جال مے ں پھنسانے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

مولانا آزاد نے صداقت زمانی اور دروغ جو ایک دوسرے سے متضاد خوبیوں کے حامل تھے، کے خاندان کا تعارف اور ان کی مثبت اور منفی خوبیوں کو بیان کیا ہے اور بتایا ہے کہ دروغ، صداقت زمانی کے ساتھ اس کی حکمرانی میں خلل ڈالنے اور اس کے بھلائی نیکی کے مشن کو ناکام بنانے کے لئے دنیا یں آموجود ہوا اور بتایا گیا ہے کہ جب دونوں قوتیں دنیا میں برسرِ پیکار ہو گئیں تو آسمانی مخلوق یعنی فرشتے بھی اس معرکہ کا مشاہدہ کرتے اور نتیجے کا بے تابی سے انتظار کرتے کہ کون فاتح اور کون مفتوح ٹھہرے گا۔

غرض کہ ملکہ صداقت شاہانہ وقار اور دبدبہ سے کامیابی کے یقین کے ساتھ دنیا میں آموجود ہوئی۔ ہر جگہ اس کا والہانہ استقبال ہوا یعنی لوگوں نے سچائی کو اختیار کیا اور اس پر ڈٹے رہے۔

مولانا آزاد نے صداقت زمانی اور دروغ جو ایک دوسرے سے متضاد خوبیوں کے حامل تھے، کے خاندان کا تعارف اور ان کی مثبت اور منفی خوبیوں کو بیان کیا ہے اور بتایا ہے کہ دروغ، صداقت زمانی کے ساتھ اس کی حکمرانی میں خلل ڈالنے اور اس کے بھلائی نیکی کے مشن کو ناکام بنانے کے لئے دنیا یں آموجود ہوا اور بتایا گیا ہے کہ جب دونوں قوتیں دنیا میں برسرِ پیکار ہو گئیں تو آسمانی مخلوق یعنی فرشتے بھی اس معرکہ کا مشاہدہ کرتے اور نتیجے کا بے تابی سے انتظار کرتے کہ کون فاتح اور کون مفتوح ٹھہرے گا۔

غرض کہ ملکہ صداقت شاہانہ وقار اور دبدبہ سے کامیابی کے یقین کے ساتھ دنیا مے ں آموجود ہوئی۔ ہر جگہ اس کا والہانہ استقبال ہوا یعنی لوگوں نے سچائی کو اختیار کیا اور اس پر ڈٹے رہے۔

لیکن دروغ چونکہ بہروپیا تھا مختلف روپ دھار دھار کر لوگوں کو اپنے معاونین کی مدد سے اپنے فریب کے جال میں پھنسا کر وقتی طور پر صداقت کو شکست دینے کی کوشش کرتا اور کبھی کبھی وہ کامیاب بھی ہو جاتا مگر اس کے پیر نہ جمتے۔ البتہ وہ سچائی کو مرعوب کرنے کی خاطر بڑی بڑی باتیں بناتا اور شور و غل کرتا ساتھ ہی دغا، فریب، طراری، بے شرمی، ہٹ دھرمی اور نمود و نمائش کے ہتھیار استعمال کرتا تاکہ صداقت زمانی کو زیر کر سکے۔

مولانا آزاد لکھتے ہیں کہ دورانِ جنگ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ سچائی وقتی پر زخمی ہو جاتی ہے۔ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ جھوٹ میں بڑی طاقت ہے اور بدی بھی پر زور ہے لیکن ان کا یہ قیاس کچھ ہی عرصے میں کافور ہو جاتا ہے کچھ ہی وقفے کے بعد سچائی صحت یاب ہو کر لوگوں کے دلوں کو مسخر کرتی ہے اور ان پر واضح کر دیتی ہے کہ سچائی پھر سچائی ہوتی ہے اور جھوٹ کے پیر نہے ں ہوتے ہے ں۔ سچائی ہی ہمیشہ رہنے والی صفت

ہے اسی ہیں مدائی غلبے کی خوبی پائی جاتی ہے اور اسے مستقل شکست نہیں دی جاسکتی۔

البتہ دروغ جب زخمی ہوتا تو اپنے زخموں کے جراثیم اوروں میں بھی پھیلاتا اور بے غیرت اور بے حیا بن کر زخم بھرتے ہی اپنی خباستوں کو وام کرنے کے لئے سچائی کے خلاف پھر صف آراء ہو جاتا ہے بہر حال ہر بار شکست کھاتا اور سچائی سرخرو ہوتی واقعی حق ہی باطل پر غلب آنے کے لئے ہے۔

سچائی کی ملکہ، ملکہ صداقت زمانی کی میدانِ جنگ میں آمد کا ذکر کیا ہے اور اُس کی شان و شوکت بیان کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ سچائی و صداقت کی اِس ملکہ کا مرتبہ نہایت ہی بلند ہے اور اِس کی شان و شوکت آنکھوں کو خیرہ کر دیتی ہے۔ اِس شخصیت کے پُر نور چہرے سے حق گوئی کا عکس نظر آتا۔ یہ نہایت آہستگی پر مستقل مزاجی سے اپنے قدم بڑھاتی ہے۔ اِس کا منزل کی جانب ہر بڑھتا قدم اس بات کی بشارت دیتا کہ منزل دور نہیں ہے اور ایسا لگتا ہے مقصد حاصل ہو گیا ہے۔ یہ ملکہ ایک مرتبہ کسی جگہ پر اپنا پُر زور قدم جما دے تو اِس قدر مستقیم ہوتا ہے کہ اِس کو ہٹانا کسی انسان کے بس میں نہیں رہتا۔ اِس مضبوط قدم کو فرشتے جیسی مخلوق بھی نہیں ہلا سکتی۔ اِس عبارت ہیں مصنف نے ایک نہایت ہی قابل غور بات پیش کی ہے۔ مصنف کہتا ہے کہ سچائی و صداقت ایک ایسی اٹل اور خوبصورت حقیقت ہے کہ ہر جگہ اِس کا زور ہوتا ہے۔ تمام عاقل و بالغ، ذہین و فطین لوگ سچائی کی بدولت ہیں اور سچ کو ایک نہایت اہم مرتبہ حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب سچ کی ابتداء ہوتی ہے تو ہزاروں گواہیاں اِس کے حق میں آتی ہیں۔ سچائی کا زور آہستہ آہستہ بلند ہوتا ہے اور بلند ہونے کے ساتھ ساتھ پوری طرح معاشرے میں سرائیت کر جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے معاشرے میں امن و سکون اور چین کی بانسری بجتی ہے اور تمام انسانوں کو اُن کے مقصد کے حصول میں آسانی ہو جاتی ہے۔ صداقت کی مہک اگر ایک مرتبہ پھیل جائے تو پورے گلشن کو دل نشین بنا دیتی ہے اور اس خوشبو کو کوئی بھی نہیں مٹا سکتا۔ یہ خوشبو ہر نئے آنے والے کے لئے حصولِ منزل کی راہ ہموار کرتی ہے اور اِس کی بدولت بندہ مومن اطمینان و سکون کے ساتھ اپنا منشاء حاصل کر لیتا ہے۔

لیکن دروغ چونکہ بہروپیا تھا مختلف روپ دھار دھار کر لوگوں کو اپنے معاونین کی مدد سے اپنے فریب کے جال میں پھنسا کر وقتی طور پر صداقت کو شکست دینے کی کوشش کرتا اور کبھی کبھی وہ کامیاب بھی ہو جاتا مگر اس کے پیر نہ جمتے۔

آزاد کہتے ہیں کہ جب کبھی اتفاقاً سچ اور جھوٹ کا آمنا سامنا ہو جاتا اور مورکہ آرائی ہوتی تو دروغ اپنی حیثیت اور طاقت بڑھا چڑھا کر پیش کرتا تاکہ اس شور و غل سے سچ مرعوب ہو جائے ساتھ ہی شیخی اور فریب جیسی قوتوں کو ابھارتا تاکہ سچائی کے قدم اکھاڑنے میں وہ اس کی مدد کریں۔ دروغ صرف انہی دو قوتوں کا سہارا نہ لیتا بلکہ اسی طرح کی دوسری قوتوں مثلاً زبان درازی، بے شرمی اور بے غیرتی کو بھی مستحرک کر دیتا اور انھیں کام لاتا۔ لالچ اور ہوس کے کاندھوں پر سوار ہو جاتا غرض دروغ ان شیطانی قوتوں کے ذریعے بھرپور حملے کرتا۔ دورانِ جنگ کبھی بھی ایک مخصوص مقام پر نہ ٹھہرتا، اپنے موقف میں تبدیلی کرتا رہتا اور غیر مستقل مزاجی کو اپنائے رکھتا۔ جونہی صداقت کی نظر اس پر اٹھتی اور اس کی حرکتوں پر دشمنانہ نظر ڈالتی تو دروغ فوراً سمجھ جاتا کہ اب اس کی خیر نہیں۔

''نیرنگِ خیال'' کے مضامین انیسویں صدی کے ربع ثالث کے بدلتے ہوئے سیاسی و سماجی نیز معاشی منظر نامے کے عکاس ہیں۔ مضامین کے عنوانات اسمِ بامسمیٰ ہیں اور ہندوستانی معاشرت کے تمام اوہام و خدشات کے پر آشوب دور کے ترجمان بھی ہیں۔

وہی ستارے چراغ سحر میں رکھے ہوئے

محمد سلمان

وہی ستارے چراغ سحر میں رکھے ہوئے
تمہارے خواب میں اب تک نظر میں رکھے ہوئے

کہیں کہیں پہ تو سبزے کی چھال دیتے ہیں
کسی کے دشت مری چشمِ تر میں رکھے ہوئے

ہمیں پتہ ہے تو بس کوہ کا، بیابان کا
چمن کہاں ہیں ہماری خبر میں رکھے ہوئے

کبھ کبھی کسی مصرعے سے جھانک لیتے ہیں
ترے فراق ہمارے ہنر میں رکھے ہوئے

ترستے رہتے، دعا دیتے رہتے ہیں ہر روز
ہمارے پھول تری رہ گزر میں رکھے ہوئے

وہی ستارے چراغ سحر میں رکھے ہوئے
تمہارے خواب میں اب تک نظر میں رکھے ہوئے

صرف عنوان عرض حال ہے

مہوش اویس

میرے چہرے پہ کچھ نہیں تحریر
صرف عنوان عرض حال ہے یہ

خوش نظر ہے نہ خوش خیال ہے یہ
آج کے دیدہ ور کا حال ہے یہ

وجہ ناکامئ وفا کیا ہے
آپ سے آخری سوال ہے یہ

تم مرے دل میں کیوں نہیں آتے
شہر رعنائی جمال ہے یہ

کون جانے عروج کیا ہوگا
آدمی کا اگر زوال ہے یہ

ڈھونڈھتا ہے نئی نئی افتاد
دل ایذا طلب کا حال ہے یہ

چاہتے بھی ہیں چاہتے بھی نہیں
دوستی کی نئی مثال ہے یہ

کیسے سلجھیں گے کاکل دوراں
کتنا الجھا ہوا سوال ہے یہ

اب کوئی آنکھ نم نہیں ہوتی
دل کی دنیا میں خشک سال ہے یہ

خاموشی کے جہاں میں خاموشیاں

اطہر بیگ

کبھی کھلا ہوں کبھی بند ہو کے کھلتا ہوں
کسی عمارت خستہ کا میں دریچہ ہوں

کچھ اس طرح مرے حالات مجھ پہ حاوی ہیں
نہ اپنی نیند ہے سویا ہوں اور نہ جاگا ہوں

اتار پھینکوں بدن سے میں کس طرح ملبوس
ٹٹول کر مجھے دیکھو کہ کتنا پریشان ہوں

میں اجنبی ہوں ابھی کیسے تم کو پہچانوں
زمانے بعد تمہارے قریب آیا ہوں

نگاہوں سے مری اوجھل ہیں اب بھی ہیں آوازیں
الجھ رہی ہے نگاہیں یا میں ہی اندھا ہوں

زبان بند ہے دُنیا کی ابھی تک میرے لیے مگر
میں خامشی کے جہاں میں خود اپنا چرچا ہوں

THE ROLE OF GLUCAGON IN THE HUMAN BODY

Yusra Saleem

Glucagon, a peptide hormone, was identified and named in 1923 when chemists experimenting with "aqueous extracts of pancreas" found a substance that had a hyperglycemic effect in dogs whose pancreas was removed and in normal rabbits. Despite the initial confusion about whether glucagon was merely a contaminant during purification of insulin, researchers recognized by the 1950s that glucagon was secreted from pancreatic alpha cells, thus establishing the existence of 2 distinct pancreatic hormones, both responsive to plasma glucose levels. In 1975, Unger and Orci proposed a "bihormonal hypothesis" of diabetes on the basis of evidence that the metabolic effects of T2D result from absolute or relative hyperglucagonemia, as well as absolute or relative insulin deficiency. The authors further suggested that controlling glucagon secretion could potentially improve the treatment of diabetes.

Type 2 diabetes is a disease involving both inadequate insulin levels and increased glucagon levels. While glucagon and insulin work together to achieve optimal plasma glucose concentrations in healthy individuals, the usual regulatory balance between these 2 critical pancreatic hormones is awry in patients with diabetes. Although clinical discussion often focuses on the role of insulin, glucagon is equally important in understanding type 2 diabetes.

Normal glucose homeostasis depends largely on balanced secretion of glucagon and insulin from pancreatic alpha and beta cells, respectively, in a tightly regulated, multiloop feedback system following a meal, high plasma glucose levels (hyperglycemia) stimulate the pancreas to release insulin. Insulin promotes glucose uptake and use by insulin-dependent tissues, stimulates formation of glycogen from glucose (glycogenesis) in the liver and muscle, and suppresses glucagon secretion. When plasma glucose levels fall too low (hypoglycemia), the pancreas releases glucagon. Upon reaching the liver, glucagon promotes breakdown of glycogen

to glucose (glycogenolysis), promotes glucose synthesis (gluconeogenesis), inhibits glycogen formation (glycogenesis), and thus mobilizes export of glucose into the circulation. Thus, glucagon provides a critical response to hypoglycemia. Interestingly, our group recently demonstrated that glucagon is also secreted in patients who have undergone total pancreatectomy, demonstrating extra pancreatic secretion of glucagon in humans.

Glucagon's physiological role is broader than as a direct counter regulatory hormone to insulin. Insulin and glucagon are hormones that help regulate the levels of blood glucose — aka sugar — in your body. Glucose comes from the food you eat and moves through your bloodstream to help fuel your body. Insulin and glucagon work together to balance your blood sugar levels, keeping them in the range that your body requires.

Glucagon works to counterbalance the actions of insulin.

About 4–6 hours after you eat, the glucose levels in your blood decrease. This triggers your pancreas to produce glucagon.

This hormone signals your liver and muscle cells to convert the stored glycogen back into glucose. These cells then release the glucose into your bloodstream so your other cells can use it for energy.

This whole feedback loop with insulin and glucagon is constantly in motion. It keeps your blood sugar levels from dipping too low, ensuring that your body has a steady supply of energy.

Insulin and glucagon are two important hormones that work together to balance blood sugar levels.

Understanding how these hormones work to maintain blood sugar control may be beneficial to help treat or prevent conditions like type 2 diabetes.

Glucagon plays an active role in allowing the body to regulate the utilization of glucose and fats.

Glucagon is released in response to low blood glucose levels and to events whereby the body needs additional glucose, such as in response to vigorous exercise.

When glucagon is released it can perform the following tasks:

Stimulating the liver to break down glycogen to be released into the blood as glucose Activating gluconeogenesis, the conversion of amino acids into glucose Breaking down stored fat (triglycerides) into fatty acids for use as fuel by cells Glucagon secretion in response to meals varies depending on what we eat:

In response to a carbohydrate based meal, glucagon levels in the blood fall to prevent blood glucose rising too high.

In response to a high protein meal, glucagon levels in the blood rise.

Glucagon can be administered by injection in response to severe episodes of hypoglycemia. Glucagon is useful for people treating their diabetes with insulin.

▪

MESSAGE OF TOLERANCE

Sami ullah

The Sufism is not just a theory for Sachal Sarmast rather; it has emerged as an experience and attitude of life.

Sachal Sarmast's thought ranged from religious harmony to tolerance and its dissemination would help maintain intellectual balance not only in Sindh but across the subcontinent.

Sachal Sarmast was one of most important poets of Sindhi classical poetry. "There is centuries of consciousness and awareness in his words. His poetry is based on raaga, which is an intellectual requirement of time to highlight Sindhi consciousness," Sachal's message was about tolerance, forbearance, religious harmony and love, which needed to be further explored and also popularized among youth. Sachal Sarmast's name is one of the most prominent in Sindh after Hazrat Shah Abdul Latif Bhittai.

Sachal spread the message of religious tolerance through his poetry and play a significant role for spiritual awakening in the Indus Valley. The Sachal Sarmast's poetry does not believe in language, race, region and religious boundaries between human beings but advocates the

formation and welfare of society according to his universal ideology.

Mehtab Akbar Rashdi said "the era of Sachal Sarmast was the era of Kalhora and Talpur rulers of Sindh where extremism and religious hatred were at their peak. In such a situation, Sachal Sarmast turned the Sindh into a place of peace for the common man through his poetry".

The poetry of Sachal Sarmast has been introduced in the circle of Danish Sufi since 1291 and is working as a beacon for the seekers of unity, existence, spirituality and peace of mind.

It is the perfection of Sachal's mysticism that a person has not gone out of his area all his life. He is giving a universal message with great simplicity, cleanliness, elegance and enthusiasm, sitting in a remote town like Darza. Sachal Sarmast is called Mansoor Sani and Attar Sindh, but if their intellectual sources are studied, Hafiz Shirazi also has a profound effect on Sachal. The love for human beings is the belief of all Sufis but Sachal has the characteristic that he was familiar with all the languages spoken in the region except his mother tongue Sindhi.

Mansoor Ho Ya Sarmad Ho Sanam
Be it Mansur Hallaj or Sarmad, O Beloved
Ya Shams Ul-Haq Tabrezi Ho

Or be it Sham Tabrezi
Is Teri Gali Men Aye Dilbar, Is Teri Gali Men Ay Dilbar
When they came to your lane, O Irresistible One

Har Ek Ka Sar Qurbaan Huwa
Each one sacrificed his life in Your Love
Hairan Hua, Hairan Hua

O how wonderstruck I am!

The narration of all the romantic stories of the region in the poetry of Sachal Sarmast is not an observance of any ritual or tradition but the process of finding a suitable expression for expressing one's thoughts and ideas.

عشقَ دے باجھوں بیا سبھ کوڑ سولی تے منصور
نہ کوئی دوزخ نہ کوئی جنت نہ کوئی حور قصور
نہ ساڈا من منیندا ملیاں دا مزکور
دئیں جوانی لنگھ گیو سے تن تھیوسے جھور
ظاہر دیکھیون یار سجن دا نینی والا نور
بیا سبھ باہیں پھر تیاں پھاہیاں چھوڑن ہینی ضرور
سچل سچ سیئ کر جانے ہے توں آپ حضور

■

وزیر اعلیٰ سندھ سید مراد علی شاہ مقامی ہوٹل میں ورلڈ بینک کی رپورٹ
"پاکستان ہیومن کیپیٹل ریویو: بلڈنگ کیپبلٹیز فار لائف" کی تقریب رونمائی سے خطاب کر رہے ہیں۔

وزیراعلیٰ سندھ سید مراد علی شاہ وزیراعلیٰ ہاؤس میں آئندہ مالی سال 2023-24 کے
سالانہ ترقیاتی پروگرام (ADP) کا فیصلہ کرنے کے لیے اجلاس کی صدارت کر رہے ہیں۔

گوپی چند نارنگ: اردو زبان و ادب کے بادشاہ

اُردو زبان میں گوپی چند نارنگ کا تخلیقی سفر کا آغاز افسانہ نگاری سے ہوا۔ اُن کا پہلا افسانہ کوئٹہ شہر کے ہفتہ وار اخبار ''بلوچستان سماچار'' میں اُس وقت شائع ہوا تھا جب وہ اسکول میں زیر تعلیم تھے۔ رسائل میں لکھنے کی لت لڑکپن میں پڑ چکی تھی۔ جب 1947 میں وہ دہلی آئے تو یہاں پر بھی اُن کے متعدد افسانے 'بیسویں صدی' اور 'ریاست' جیسے رسائل و جرائد میں شائع ہوتے رہے۔ 1953 کے بعد گوپی چند نارنگ نے افسانہ نگاری کی دُنیا کو ترک کر کے تحقیق و تنقید کی دُنیا میں قدم رکھا۔ اُن کا اوّلین مضمون 'اکبر الٰہ آبادی سخن فہموں اور طرفداروں کے درمیان' 'رسالہ نگار' میں جون 1953 میں شائع ہوا اور اُن کا تخلیقی و تنقیدی سفر آج تک جاری و ساری ہے۔ اُن کی پہلی تصنیف 'ہندوستانی قصّوں سے ماخوذ اُردو مثنویاں' ہے جو پہلی بار 1959 اور دوسری بار 1961 میں شائع ہوئی۔ اس کتاب پر نارنگ صاحب کو 1962 میں 'غالب ایوارڈ' سے نوازا گیا۔ اس کے بعد سے اب تک نارنگ صاحب کی تقریباً پانچ درجن سے زیادہ کتابیں منظرِ عام پر آکر ادبی حلقوں میں اپنا جلوہ بکھیر چکی ہیں۔ 2014 میں گوپی چند نارنگ نے 'غالب: معنی آفرینی، جدلیاتی وضع، شونیتا اور شعریات' ایک بے مثال تحقیقی اور تنقیدی کتاب غالب شناسی کے ضمن میں پیش کر دی ہے۔ جو اندھیرے میں سب سے بڑا جگمگاتا ہوا قدم ہے۔ جو آنے والی صدیوں تک غالبیات میں ایک ذہنی راہ نما قدم ثابت ہوگا۔